ملتان کی ابتدائی تاریخ

مورخ: سید محمد لطیف

مترجم: جمشید اقبال

تعارف

زیرِنظر کتاب گذشتہ پچھتر برسوں سے طلباء، محققین اور دانشوروں کے لئے سرچشمۂ معلومات رہی ہے۔اس کتاب کے مصنف راقم الحروف کے دادا جان، سید محمد لطیف، ہیں جنہوں نے اس کتاب کو 1891 میں شائع کروایا اور اپنی اشاعت کے فوراً بعد اس کتاب نے ملتان کی مستند اور جامع تاریخ کا مقام حاصل کرلیا۔ برصغیر کی تاریخ کا علم ملتان کی تاریخ کے علم کے بغیر ادھورا ہے کیونکہ اس خطے کی تاریخ کے ہر دور میں ملتان خصوصی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔

سید محمد لطیف کے دوسری تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی کافی عرصے تک شائع نہ ہوسکی اور ابتدا میں شائع ہونے والے چند نسخوں کی قیمت حدِ معقولیت سے متجاوز تھی۔اس وقت ملتان تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہوگیا ہے اور اس حوالے سے اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔یہی وہ وقت ہے جب اس شہر کی مستند تاریخ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے اور اسی لئے اس بات کو ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس مستند اور گرانقدر کتاب کو اہلِ ذوق کے لئے عام کردیا جائے۔اس وقت تک میں عزم کرچکا ہوں کہ سید محمد لطیف کی کتب کو از سرِنو شائع کروا کر تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے ذوق کو سیر کروں۔زیرِنظر کتاب بھی میرے اسی عزم کا زندہ ثبوت ہے۔اس کام کا آغاز میں نے 1957 میں کیا تھا جب میں نے ان کی کتاب ''لاہور؛ تاریخ، تعمیرات اور آثارِ قدیمہ'' کو جدید تقاضوں کے مطابق شائع کروایا۔اس کتاب کی اس حد تک تعریف کی گئی کہ میں ان کے دیگر کاموں کو جامۂ اشاعت پہنانے پر مجبور ہوگیا۔

ملتان کی ابتدائی تاریخ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔مجھے یقین ہے کہ عام قاری کے ساتھ ساتھ دانشور حضرات بھی اس بیش قیمت کام کو سراہیں گے اور اسے اپنی بہترین کتابوں میں رکھیں گے۔

سید محمد منہاج الدین

جون 1961

مصنف

برصغیر پاک و ہند کے مورخین میں سید محمد لطیف منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تاریخ پر گہری نظر، ندرت اور معروضیت ان کی وہ لاثانی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر، نہ صرف، انہیں ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائیگا بلکہ یہ خصوصیات انہیں دیگر موضوعی مورخین کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد بھی بنائیں گی۔ اور یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر انیسویں سے صدی سے آج تک انہیں سب سے زیادہ مستند اور ایماندار مورخ مانا جاتا ہے۔ تاریخ نویسی کے دوران وہ صحت مند مواد کی تلاش میں دن رات ایک کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا کام آج تک تاریخ کا ذوق رکھنے والے طالب علموں اور تحقیق کا ذوق رکھنے والے محققین میں یکساں مقبول ہے اور مقبول رہے گا۔

سید محمد لطیف کا سن ولادت 1851 اور مقام لاہور ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو صحافت کے ابھرتے ہوئے شعبے اور لاہور کے تہذیبی احیاء کی تحریک میں پہل کار مانا جاتا تھا۔ ان کے والد، سید محمد عظیم، اپنے دور کے سلجھے ہوئے، اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے اور برصغیر میں صحافت کے قائدین میں سے ایک تھے۔ انہوں نے دہلی اور انگلستان سے چھپائی کی تربیت لی تھی اور اس کے بعد لاہور آ کر انہوں نے پہلا انگریزی اخبار Lahore Chronicle (جو کہ بعد میں Civil and Military Gazette کا حصہ بن گیا تھا) نکالنا شروع کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اردو اخبار، جو کہ ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا، شروع کیا اور بعد میں وہ پنجابی اور عربی اخبار، نفع عظیم، بھی نکالنے لگے۔ ان اخبارات نے نہ صرف لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہیں روشن نظر بنانے میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کے بارے میں پنجاب کے گورنر، سر چارلیس ایچسن، نے لکھا، ''ان کی حیات صحافت سے عبارت ہے جوان کی زندگی کے بیس برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ صحافت کی دنیا میں ان کی خدمات کے پیش نظر وہ غیر معمولی احترام کے مستحق ہیں''۔

یہی وہ علمی اور ثقافتی دور تھا جس میں سید محمد لطیف نے اپنے ابتدائی صورت گر اور تکاملی ایام گزارے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شخصیت پر پہلا اثر ان کے عظیم باپ کا تھا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور یہاں خوش قسمتی سے وہ ایک انگریز دانشور کے محبوب شاگرد قرار پائے۔ انہوں نے، انگریزی کے علاوہ، اردو، عربی اور فارسی میں یکساں مہارت اور روانی پائی۔ 1875 میں سید محمد لطیف کی شادی سر سید احمد خان کی بھتیجی سے ہوئی اور دو علمی اور ادبی خاندانوں کا یہ ملاپ بہت حد تک ثمر بار رہا۔ سید محمد لطیف نے اپنی محنت اور عقل سلیم سے بہت جلد ہی علمی اور ادبی معرکے مارنے شروع کر دیے۔

صحافت نے انہیں سب سے پہلے دانشورانہ ریاضت کا موقع فراہم کیا اور وہ بہت جلد ہی اپنے والد کے دست راست بن کر ان کے اخبارات میں بیش قیمت تحریروں کا حصہ ملا رہے تھے۔ کچھ عرصہ صحافت کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور پنجاب چیف کورٹ میں ریڈر کے فرائض سرانجام دینے لگے اور اعلیٰ اخلاق اور مئوثر کارکردگی کی بنا پر انہیں بہت جلد ہی ایکسٹرا اسسٹنٹ جوڈیشل کمشنر بنا دیا گیا۔ بعد میں وہ پنجاب کے مختلف ضلعوں میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کے طور پر حکومت کو اپنی خدمات

سے نوازتے رہے اور اچانک موت کے باعث بنچ میں شامل نہ ہو سکے۔

سید محمد لطیف ایک کثرت نگار مصنف واقع ہوئے تھے۔ دیگر ذمہ داریاں اور مصروفیات ان کے حصولِ علم کے ناشکیب ولولے اور تحقیق کے ناقابلِ تسخیر جذبے کو شکست دینے میں ناکام رہیں۔

وہ اس دور کے مشہور رسالے Journal of Royal Asiatic Society of Bengal اور Calcutta Reviw کے باقاعدہ لکھاریوں میں سے ایک تھے اور وہ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں، یکساں مہارت سے لکھتے تھے۔ اپنی ابتدائی عمر میں انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں ہزاروں شعر کہے اور انکا دیوان، دیوانِ لطیف کے نام سے، 1870 میں شائع ہوا۔ تاہم تاریخ سے انکا معاشقہ تھا اور وہ اپنی تمام تر توانائیاں اسی پر صرف کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ حقائق کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے تھے اور کسی ایسی بات کو صفحہ قرطاس پر لانے کو تیار نہیں ہوتے تھے جس سے تعصب کی زرہ سی بھی بو آتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعمیرات اور ان کے مطالعے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس موضوع پر گراں قدر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 51 برس تھی اور وہ مطبوعات اور نامکمل مسودوں کا ایک بیش بہا خزانہ چھوڑ کر جہانِ فانی سے اٹھے۔

آگرہ؛ تاریخ اور بیانیہ، ملتان کی ابتدائی تاریخ، تاریخِ پنجاب اور لاہور، تاریخِ پنجاب، لاہور؛ تاریخ، تعمیرات اور آثار ان کی تحقیق اور شبانہ روز محنت کا نچوڑ ہیں۔ یہ پانچ کتابیں ان کی غیر معمولی صداقت اور گہری فکر کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ہم ان کتابوں کو مقامی تاریخ پر لکھی گئی سب سے مستند کتابیں بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ تاریخ ان کا میدان ہے اور اس میں دور تک ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک سید محمد لطیف کی تحقیق سند کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا ثبوت آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے ملے گا۔

ملتان کی ابتدائی تاریخ

ملتان کا مشہور شہر، سکندرِ اعظم کی اساطیری لشکر کشی کے دوران، پنجاب میں مالی کا دارلحکومت تھا اور دریائے چناب سے چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس دور کا دریا اپنے ساتھی دریاؤں، راوی اور جہلم، کے پانیوں کو اپنے سینے میں لئے اس قدیم شہر کو سیراب کرتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ یہ شہر صدیوں کی شکست وریخت کے انبار پر واقع ایک قلعے پر کھڑا تھا اور شہر کے اردگرد تباہ شدہ مکانوں کا ملبہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا جو اس کی قدامت اور بزرگی کا تاسف انگیز ثبوت فراہم کرتا تھا۔ شروع میں ملتان کا قلعہ، جس کی فصیلوں کے اندر شہر ملفوف تھا، دریائے راوی کے دو ''جزیروں'' پر آباد ہوا۔ اس معمر شہر کا قدار دگرد کے علاقوں سے 150 فٹ بلند تھا اور اس بلندی نے اس کے وقار کو چار چاند لگا دیے تھے۔ تاہم مذکورہ دور سے صدیاں پہلے دریائے راوی اس شہر کو تیاگ کر تیس میل دور مغرب میں بہہ رہا تھا۔ تاہم اس کا پرانہ راستہ اسوقت بھی ان دونوں کی دوستی کا پتہ دیتا تھا۔ اس وقت بھی بارشوں کا پانی اس ہرجائی دریا کے پرانے راستوں جمع ہو کر اس قدیم رشتے کا سراغ دیتا ہے جو آج صرف قدیم یونانی مورخین کی کرم خوردہ تاریخی یاداشتوں میں ''محفوظ'' ہے۔ سکندر کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ اس تیاگی دریا کا پانی شہر کے قلعے کے گرد سرمست یاتری کی طرح طواف کیا کرتا تھا۔

اس شہر کا پہلا نام، جہاں تک تاریخ کی یاداشت ساتھ دیتی ہے، کاسیاپا پورہ تھا۔ کاسیاپا، قدیم ہندو دیومالا کے مطابق، بارہ سورج دیوتاؤں (Aditays) کا باپ تھا اور اس شہر کا بانی تھا۔ اسی نسبت سے ہندوستان بھر میں یہ شہر مہر پرستی (Solar Worship) کا گہوارہ مانا جاتا رہا ہے اور سکندر کے دور سے لے کر آج تک اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں اس شہر کے قدیم باسی، سحابِ حیات، سورج کو اپنا خدا مانتے تھے۔ تاہم قدیم تاریخی دستاویزات کے مطابق، مہر پرستی کی داغ بیل ڈالنے والا پرم پرش کرشنا کا بیٹا سمبا تھا، جو کہ بنا کا بطلِ فعال مانا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ اس کے باقی بھائی بھی شامل تھے۔ یہ روایات مذید بتاتی ہیں کہ دیتیا نے وشنو کی ہمہ جائیت کا انکار کیا تھا اور اس نے نراسنہا کی تجسیم (تجسیمِ وصف) عمل میں آئی تھی جو کہ آدھا شیر اور آدھا آدمی تھا۔

اسی کے پیش رو پربھالا دا، جس کی نسبت سے ملتان کا نام بعد میں پربھالا دا پورہ پڑا، نے مہر پرستی کی مردہ روایت میں ایک بار پھر حیاتِ نو پھونکی اور مقامی دیوتا کا مرتبہ پایا۔ ویدک دیوتاؤں میں جو چیز سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے وہ فطرت اور ویدک دیوتاؤں کی حیرت انگیز قربت ہے اور اسی لئے، ہندو دیومالا کے مطابق، دیوتاؤں کو خوش کرنے سے فطرت کے قوانین بدل سکتے ہیں۔ ویدک شاستروں کے مطابق مترا اورورن آسمان کے دیوتا ہیں جن میں سے مترا، خاص طور پر اس دور میں، ایک عظیم سورج دیوتا سمجھا جاتا تھا، جس کی خالص و صادق عبادت کے صلے میں سمبا کو خوردنامیہ سے پیدا ہونے والے مزمن مرض جزام سے نجات ملی تھی۔ سمبا فرط تشکر سے اس حد تک مجبور تھا کہ اس نے ملتان میں مترا کا ایک عالیشان مندر تعمیر کروایا اور اس میں مترا کا طلائی مجسمہ سجا دیا۔ اس نے اس مندر کو ادیبا س تھانا کے نذر گزار کر دیا اور اس کا نام بھی یہی رکھ دیا۔ مترا کا یہ طلائی مجسمہ ملتان کا معروف ومدوح دیوتا قرار پا گیا جس کی عقیدت ہندوستان بھر سے لاکھوں یاتریوں کو اس شہر میں لاتی اور یہ شہر، صدیوں تک، ہندوستان کے مقدس ترین شہروں میں سے ایک مانا جاتا رہا۔

ایک اور اسطورہ (روایت) جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ کاسیاپاپورہ ہی اس شہر کا اصل نام تھا، وہ قدیم مورخین کی کہنہ یاداشتیں ہیں جو دوسرے خطوں سے ہندوستان میں آئے۔ ان قدیم مورخین میں پانچویں صدی قبل مسیح کا مشہور یونانی سیاح ہیقاطیس (Hecataeus) اپنے دنیا بھر کے سفر کی روداد (Ges periodos or Periegesis) میں اسے کاسپاپورس کہتا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں سکندریہ کا معروف ریاضی دان، جغرافیہ دان اور سیاح ٹولمی (Claudius Ptolemaeus) اسے کاسپریا کہتا ہے اور مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس، جو دنیا کہ اوّلین مورخین میں سے ایک ہے، ملتان کو کاسپاپُوروس کے نام سے یاد کرتا ہے۔ قدیم سنسکرت ادب میں کاسیاپاپورہ کا نام کئی مرتبہ آتا ہے اور اس کے ساتھ، دیگر شہروں میں، بھاگاپورہ، سمباپورہ بھی شامل ہیں۔ انہیں ناموں میں جرنل کنہنگم دو ناموں؛ پراہلادا پورہ اور ادیاس تھانا، کا اضافہ کرتا ہے جن کا لفظی ترجمہ ''اوّلین تبرک خانہ'' قرار پاتا ہے۔ یہ اوّلین تبرک خانہ، بلاشبہ، مترا کا مندر تھا جس میں اس کا طلائی بت رکھا ہوا تھا۔

ٹولمی کہتا ہے کہ کاسپریا عین اس مقام پر موجود تھا جہاں دریائے راوی (Rhuadis) بل کھا کر، مغرب کی طرف، اپنے آپ کو چندرہ بھاگا (چناب) کے سپرد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ملتان کا جدید شہر راوی کے کناروں پر موجود نظر آتا ہے اور تیمور (1398-99 A.D) کے دور تک یہ دریا ملتان کا طواف کر کے آگے بڑھتا ہے؛ ہے بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ٹولمی کا کاسپریا دراصل ملتان ہی ہے اور حقیقت عتیقیاتی (Antiquarian) نقطہ نظر سے اس حد تک اہم ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ، دوسری صدی عیسوی کے وسط میں، موجودہ ملتان سے منصورہ تک پھیلا ہوا تھا اور پنجاب کا اہم ترین شہر تھا۔

سورج دیوتا کے مندر کے شہر (مالاستھانا پورہ) کا اوّلین ذکر، جس سے جدید شہر ملتان کا نام پڑا، سب سے پہلے مشہور چینی یاتری ہوان ژانگ کے سفر ناموں میں ملتا ہے جس نے 641 عیسوی میں زنگالا (بلوچستان)، پٹالا (حیدرآباد)، الور اور سندھ کا سفر کیا اور ملتان بھی تشریف لایا۔ ہندوستانی تاریخ کا یہ دور راجہ چاچ کا دور تھا جس نے رائس کے شاہی خاندان سے اقتدار چھین کر ہندوستان کے تخت کو رونق بخشی تھی اور 631 عیسوی میں ملتان کے صوبے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ رائس کا بھائی، چندا، اس کی موت کے بعد ملتان کا حکمران بنا جو بدھ مت کا پر شوق اور مستعد پیروکار تھا۔

یہ عظیم چینی سیاح ملتان شہر کو پانچ میل کے دائرے کے اندر آباد شہر قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے اس دورے کے دوران مترا کا طلائی مجسمہ بھی دیکھا جو کہ زرق برق لباس میں ملبوس ایک بلند چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مترا کا مندر ہر وقت زائرین سے بھرا رہتا تھا اور ہندوستان کا ہر راجہ، مہاراجہ اس عظیم بت کے سامنے کھڑا ہو کر منتیں مانگتا تھا اور مراد پوری ہو جانے پر نذرانوں کی بارش کر دیتا تھا۔ وہ اس شہر کو میلُو۔سان۔پولو کہتا ہے جو کہ ہندی لفظ مالاستھانا پورہ کی صوتی نقل ہے۔

اس کے علاوہ اس طلائی مجسمے کا ذکر بھاوشیہ پرانہ نامی قدیم سنسکرت شاستر میں بھی ملتا ہے۔ اس شاستر میں مترا کے مندر میں موجود خزانے کا بھی ذکر ہے جس کی وجہ سے عرب فاتحین اسے ''فراج'' (سونے کا گھر) کہا کرتے تھے۔ ملتان میں مسلمان فوج کا پہلا قدم ۴۴ ہجری (664 A.D) میں پڑا جب خلیفہ ابوبکر صدیق کے دور میں ایک عرب جرنیل، مہالب، اپنی فوج سے کسی طرح الگ ہو کر ملتان کے

دارالحکومت آن پہنچا۔ حالب جب واپس گیا تو وہ اپنے ساتھ ہزاروں ہندوستانیوں کو جنگی قیدی بنا کر لے گیا۔ تاہم اس کی آمد کا مقصد اس علاقے کو فتح کرنا نہیں تھا بلکہ مستقبل میں وسعت پسندی کے امکانات پیدا کرنے کے لئے نئے علاقوں کی دریافت تھا۔

عرب زبان میں لکھا گیا ''چچ نامہ'' عام طور پر طویل اور اکتا دینے والی تقاریر پر مشتمل کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ایلفن سٹون کہتے ہیں، ''یہ محمد بن قاسم کے حملے کے وقت کی جزئیات کو سامنے سامنے لانے والی اور خفیف، موضوعی اور معروضی، تاثرات کو محفوظ کرنے والی مفصل روداد ہے جو غالباً منصورہ کی تعمیر سے پہلے لکھی گئی تھی''۔ دراصل منصورہ کی تعمیر 753 عیسوی میں، خلیفہ منصور کے دور میں، ہوئی تھی اور مسلمانوں نے اسے سندھ کا دارالحکومت بنایا تھا۔ اس شہر کو برہمن آباد کے قریب تعمیر کیا گیا تھا جسے دائدرس (Diodorus Siculus)، پہلی صدی قبل مسیح کا عظیم یونانی مورخ جسے عالمگیر تاریخ (Bibliotheca historica) لکھنے کا شرف حاصل ہے، ہرماتالیہ کہتا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور قصبے کا ذکر نہیں کرتا۔ تاہم سندھ میں آنے والے عرب مورخین اس کے ساتھ باقی قصبوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

چچ نامہ کا مصنف، راجہ چچ، محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہونے والے اس شہر کو ''سِقا ملتان'' کہتا ہے۔ وہ اس کتاب میں کئی خونخوار لڑائیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جن میں، دونوں طرف سے، خون کے دریا بہتے دکھائے جاتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے ہزاروں انسانوں کو اپنی تلوار کا نشانہ بنانے کے بعد اسکلاندہ کا مضبوط قلعہ فتح کیا اور اپنی تمام فوج کے ساتھ سِقا ملتان کی طرف چل پڑا۔ ملتان، چچ نامہ کے مطابق، اس وقت دریائے راوی کے جنوبی کنارے پر واقع تھا اور راجہارہ کی فوج میں شامل ملتان کے سپوتوں نے اس کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ محمد بن قاسم نے ملتان کو آسانی سے فتح نہیں کر لیا تھا بلکہ اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ محمد بن قاسم اور راجہارہ کی فوج کے درمیان سات دن تک جنگ لڑی گئی تھی اور اس جنگ میں کئی اہم مسلمان جرنیل مارے گئے تھے۔ تاہم جب محمد بن قاسم کی فوج کا پلڑا بھاری ہوا تو اس نے تمام لڑنے والوں کو بے دردی سے مار دیا؛ متراکے مندر کے چھ ہزار پروہتوں اور پنڈتوں کو غلام بنا لیا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں معصوم عورتوں اور بچوں کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس فتح کے بعد اس نے ملتان میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

جب ملتان فتح ہو چکا تو محمد بن قاسم نے متراکے مندر کا رخ کیا۔ جب وہ اس مندر کے تہہ خانے میں پہنچا تو خزانوں کے ڈھیر اس کے منتظر تھے اور بعد میں، فاتح کی فرمائش پر، مقامی لوگوں نے بھی خزانے کی تکثیر میں محمد بن قاسم سے ہر ممکن تعاون کیا۔ مشہور مورخ ابوریحان، جسے یہ واقعہ ابومحمد ہندوی نے سنایا تھا، خزانے کی دریافت کے واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے، ''محمد بن قاسم کھڑا ہوا اور اپنے محافظوں اور فوجی دستوں کے ساتھ مندر میں داخل ہو گیا۔ مندر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اس عظیم بت پر پڑی جسے خالص سونے سے بنایا گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں یاقوت رمّانی (لعل) جڑے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ بت اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں کے نایاب پتھر چمک رہے تھے، محمد بن قاسم نے اسے ہندوستانی سپاہی سمجھ لیا اور نیام سے تلوار نکال کر آگے بڑھا۔ چند براہمن، جو اس وقت اس مندر میں موجود تھے، اسی وقت اس کی تعظیم میں جھک گئے اور کہا کہ اس بت کو ملتان کے حکمران جباوائی نے بنوایا تھا اور اس کے تہہ خانے کے حوض میں اتنا خزانہ دفن ہے کہ شاید زمین کے سینے میں اتنا بڑا خزانہ دفن نہ ہو۔ اس پر عرب جرنیل نے بت کو اس کی جگہ سے ہٹانے کا حکم دیا۔ جب بت کو ہٹایا جا چکا تو وہ ایک راستے سے وسیع و عریض ایوان کو دیکھ سکتے تھے۔ اس ایوان میں اترنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اب وہ ایک

ایسے ہال میں کھڑے تھے جہاں ان کے سامنے سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ان گنت مرتبانوں میں خالص سونے کا برادہ بھرا ہوا تھا۔ جب بعد میں اس سونے کا وزن کیا گیا تو وہ تیرہ ہزار دو من کے لگ بھگ تھا''۔

محمد بن قاسم کو اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اتنا زیادہ خزانہ کہاں سے آتا ہے اور شہر کے لوگوں کی خوشحالی کی کیا وجہ ہے؟ محمد بن قاسم کو بتایا گیا کہ مندر میں موجود خزانہ یاترا کرنے والے لوگوں کی عقیدت کا اظہار ہے جو ہندوستان کے طول عرض سے اپنی مرادیں پوری ہونے پر یہاں ڈھیر کر جاتے ہیں۔ محمد بن قاسم چاہتا تھا کہ مترا کا بت اپنی جگہ پر موجود رہے تاکہ وہ وقتاً فوقتاً خزانے پر ہاتھ صاف کر جایا کرے۔ لہذا محمد بن قاسم نے اس بت کو مندر میں کھڑا رہنے دیا لیکن برہمی کے اظہار کے طور پر گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس بت کے گلے میں لٹکا دیا۔ محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد سے اُموی خلافت کے اختتام تک یہ بت یاتریوں کی یاترا کا مان رکھتا رہا۔

چچ نامہ میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سِقا دریائے راوی کے کنارے، ملتان کی مخالف سمت، موجود ایک قلعہ تھا۔ چچ نامہ میں لکھا ہے، ''راجہ چچ نے راجہارہ کو شکست دی؛ راوی کے کنارے سِقا پر قبضہ کر لیا اور دارالحکومت کو محاصرے میں لے لیا''۔ شکست کے بعد راجہارہ شہر کی دیواروں کے ساتھ بیٹھ گیا؛ تاہم کشمیر کے فرمانروا کے کہنے پر باعزت طریقے سے اقتدار دشمن کو سپرد کرنے پر تیار ہو گیا۔ ابوالقاسم، جو مشرقی علماء میں ابن خردابہ کے نام سے مشہور ہے اور بغدادی خلفاء کے دور کا عظیم مورخ اور جغرافیہ دان ہے، ان ابتدائی عرب جغرافیہ دانوں میں سے ایک تھا جنہوں ہندوستان اور مشرقی جغرافیہ کو تحریری شکل دی۔ اس کی ایک کتاب کا نام ''کتاب الممالک وشاہرات'' ہندوستانی اور مشرق کے قدیم جغرافیہ پر بیش بہا معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب کی 'اشاعت'' کا سال مستور ہے لیکن اس کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جغرافیہ دان نے اپنے فراغت کے لمحات میں خوب محنت کی اور اپنی وفات (912 عیسوی) تک کی تحقیق کو اپنی کتاب میں شامل کیا۔

ابوالقاسم ملتان کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ شہر سجستان کے دارالحکومت زرانج سے دو ماہ کے فاصلے پر تھا۔ یہ مورخ اور جغرافیہ دان بھی، دیگر عرب مورخین اور فاتحین کی طرح، اس شہر کو ''فراج'' کے نام سے یاد کرتا ہے کیونکہ محمد بن قاسم یہاں سے سونے کا پہاڑ لوٹ کے لے گیا تھا اور اسی نسبت سے عرب میں ملتان ''سونے کا ذخیرہ'' مانا جاتا تھا۔

بغداد کا المسعودی 915 عیسوی میں سندھ آیا اور 330 عیسوی میں اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مرغزار طلائی'' (Meadows of Gold) تحریر کی۔ یہ مورخ ان علاقوں میں اسلام کے روشن حال کو ضابطہ تحریر میں لاتا ہے اور ایک مقام پر ملتان کے بارے میں لکھتا ہے، یہ شہر مسلمانوں کے ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اردگرد ایک سو بیس قصبے اور گاؤں موجود ہیں''۔ المسعودی جیسے مستند اور صادق مورخ کا یہ بیان اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ اس دور میں اپنی زرخیزی اور خوشحالی کی وجہ سے ملتان مسلم علاقوں میں اہم مقام ترین مقام رکھتا تھا۔ مترا کے بت کے بارے میں مورخ لکھتا ہے، ''سندھ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول وعرض سے لوگ اس مندر کی یاترا کے لئے آتے ہیں، مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں، سونے اور ہیرے جواہرات کی صورت میں، نذرانے پیش کرتے ہیں؛ اور کوار گندل کی خوشبو دار لکڑیوں کی آگ جلاتے ہیں۔ ملتان کے مسلم حکمرانوں کی سرکاری آمدنی کا سب سے بڑا زریعہ یہی مندر ہے۔ جب آسنک ہندو قطار

اندر قطار اس مندر کی طرف کھچے چلے آتے ہیں تو مقامی مسلمان ان نہ ماننے والوں (ہندوؤں) کو دھمکاتے ہیں کہ وہ ان کے بت کو توڑ ڈالیں گے ۔اس کے بعد ہندو بت پر خزانوں کی بارش کر دیتے ہیں اور نہ ماننے والوں (مسلمانوں) کے خلاف منتیں مانگتے ہیں''۔

المسعودی کہتا ہے کہ اس دور میں ملتان کا امیر قریش خاندان کا ایک عرب تھا جو دولت منابع بن اصداص سامی کے نام سے مشہور تھا اور اس نے یہاں موروثی بادشاہت کو رواج دیا ہوا تھا۔المسعودی ملتان کو تمام غیر مسلم مقبوضہ علاقوں میں سے عظیم ترین شہر قرار دیتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ قنوج بھی اس صوبے کا ایک شہر ہے۔

تختِ جمشید، شیراز سے اکاون کلومیٹر پر موجود ایرانی شہر جو اس دور میں ایران کا دارلحکومت تھا، کا استخاری اور بغداد کا ابن حوقل، جس نے اپنے کام کی بنیاد استخاری کے کام کو بنایا، ملتان کے اس روشن دور کی روشن تاریخ کو قلم بند کیا۔ یہ دونوں اس شہر کو، دفاعی لحاظ سے، نا قابل تسخیر قرار دیتے ہیں اور اسے منصورہ کے مقابلے میں نصف گردانتے ہیں۔ دونوں مورخین مترا کے بت کو زائرین کا قبلہ مقصود قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مندر 300 فٹ اونچا ہے اور یہ ایک مضبوط ترین عمارت ہے۔اس دور کا مندر بازار کے عین وسط میں موجود تھا اور اس کے گرد ایک بہت بڑا صرافہ بازار تھا جس میں سونے کے ساتھ ساتھ چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات بنائے جاتے تھے۔خواتین اس بازار سے ہاتھی دانت کے چُوڑے، دیگر آرائشی سامان اور تانبے کے برتن خریدا کرتی تھیں۔

مورخین لکھتے ہیں، ''مترا کا بت بیس فٹ بلند تھا اور مندر کے عین وسط میں موجود تھا جس کے اردگرد زائرین اور پروہت آلتی پالتی مار کر مراقبے میں گم نظر آتے تھے۔اس بت کا چبوترہ لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر قرطبہ کے چمڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ یہ بت بھی مراقبے کی حالت میں بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا، اس کے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر دھرے ہوئے تھے اور تمام انگلیاں بند تھیں۔اس کی آنکھوں میں دو لعل جڑے ہوئے تھے اور سر پر طلائی تاج جگمگا رہا تھا''۔

شہر سے آدھے میل کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض چھاؤنی، چندروار، واقع تھی اور اس چھاؤنی میں ملتان کا گورنر رہا کرتا تھا۔ گورنر کا تعلق قریش قبیلے سے تھا اور منصورہ کا حکمران اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے شدید ناپسند کرتا تھا۔ یہ گورنر بغداد کے خلیفہ کے نام خطبہ پڑھوایا کرتا تھا اور وہ جمعہ کے دن علاوہ شہر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ جمعہ کے روز وہ اجتماعی عبادت میں شریک ہونے کے لئے ایک بہت بڑے ہاتھی پر مسجد میں آیا کرتا تھا۔

ہوان ژونگ اور سنسکرت کتابوں کا طلائی مجسمہ اس دور میں لکڑی کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس ''انقلاب'' سے بے خبر رہتی ہے۔ چچ نامہ کے مصنف کے مطابق، جو محمد بن قاسم کے حملوں کا ہم عہد ہے، ملتان کے طلائی مجسمے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا اور اسے چند ''بڑے مقاصد کے لئے باقی رہنے دیا گیا تھا۔

ان سب کے بعد ابوریحان البیرونی کے شہرہ آفاق سفرناموں میں ملتان کا تذکرہ موجود ہے۔ابوریحان البیرونی نے اپنے مشہور سفرنامے اپنے آقا محمود غزنوی، کی وفات کے چند ہفتے بعد لکھے تھے۔ وہ محمود کے ساتھ ہی ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور اس نے ہندو فلسفے، مذہب، رسموں، ادب اور جغرافیہ پر گراں قدر کام کیا ہے۔ وہ ملتان کو ملاستھانا کہتا ہے اور محمد بن قاسم کے حملے کے حوالے سے لکھتا ہے، ''محمد بن قاسم

نے سندھ میں سجستان کے راستے سے داخل ہوکر ملاستھانا اور بہمانوا کو فتح کیا۔ان میں سے پہلے شہر کو وہ المنصورہ کہتا ہے اور دوسرے کو المعمورہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔البیرونی لکھتا ہے،''محمد بن قاسم کے ہندوستان داخل ہوتے ہی اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور قنوج جا کر یہ طوفان تھم جاتا ہے۔ان فتوحات کے بعد وہ گندھاوا سے ہوتا ہوا کشمیر کے راستے ہندوستان سے باہر نکل جاتا ہے''۔

وہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب کرماتی ملتان کے حکمران بنے تو جلام بن شائبان، جو شیعہ مسلک سے تھا اور اس نے اموی قبیلے سے ملتان کو بزور شمشیر چھینا تھا، نے ہندوؤں کے اس عظیم مندر کو گرادیا اور بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔اس کے بعد اس نے ایک انتہائی قدم اٹھایا اور مندر میں موجود تمام پرہتوں اور براہمنوں کے سر قلم کر دیے اور مندر کو جامع مسجد میں تبدیل کر دیا۔اموی خلفاء سے نفرت کا اظہار کے لئے اس نے پرانی مسجد کو بند کر دیا۔

البیرونی لکھتا ہے کہ جب تائیدِ ایزدی پانے والے سُنی سلطان، محمود غزنوی، نے 1005 عیسوی میں کرماتیوں کو شکست دی تو اس نے محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ پرانی مسجد کے دروازے کھول دیے اور پھر اس مسجد میں نمازِ جمعہ کے اجتماعات باقاعدگی سے ہونے لگے۔اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے مندر میں بنائی گئی مسجد کو بند کر کے بالکل نظر انداز کر کے عمل تحلیل اور شکست وریخت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

معروف مورخ فیریشتہ کے مطابق ملتان کا حکمران شیخ حامد لودھی محمود غزنوی کے باپ سبکتگین کو باقاعدہ خراج بھیجا کرتا تھا؛ تاہم اس کے پوتے داؤد نے غزنوی سلطانوں کا ہاتھ جھٹک دیا اور انند پال کے پیش رو اور لاہور کے راجہ جیپال کے ساتھ شامل ہوگیا۔محمود غزنوی نے بھاتندا کے راستے ملتان میں داخل ہوکر اس شہر کا سات دن تک محاصرہ کئے رکھا۔تاہم اس سے قبل داؤد اپنے حلیف انند پال کی، پشاور کے نزدیک، شکست کی خبر سن چکا تھا اور اب اسے احساس ہو چلا تھا کہ وہ تنہا غزنوی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔سات دن کے محاصرے کے بعد داؤد نے ہتھیار ڈال دیے اور سلطان محمود غزنوی سے معافی مانگ لی۔محمود غزنوی نے بیس ہزار سالانہ خراج کے بدلے حکومت اس کے حوالے کر دی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

غزنی سلطنت کے زوال کے بعد مقامی ہندو حکومت کو ایک بار پھر عروج نصیب ہوا۔تاہم یہ عروج عارضی ثابت ہوا اور ملتان ایک بار پھر شیعانِ علی کی گود میں جا گرا اور 1176 عیسوی تک انہی کے قبضے میں رہا۔اس مرتبہ شیعانِ علی کے قدموں سے پایہِ تخت کھینچنے والا سلطان شہاب الدین محمد غوری تھا۔محمد غوری نے اس وقت غزنی کی باگ ڈور سنبھالی اور فوراً اپنی فوج کو ملتان فتح کرنے کے لئے بھیجا جسے اس کی فوج نے آسانی سے فتح کر لیا۔اس معرکے کے بعد سلطان محمد غوری نے علی کرمانی کو ملتان اور اُچ کا گورنر بنایا۔

یہ وہی سلطان محمد غوری تھا جس نے ہندوستان میں پرتھوی راج کا خاتمہ کیا اور اُم البلاد دہلی کو 1193 عیسوی میں اپنا پایہِ تخت بنایا اور اس طرح ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔تاریخ کے اس موڑ سے ملتان، جو اس سے قبل عرب خلفاء کے تابع تھا، غزنی کی آغوشِ تابعیت میں آ گیا اور آہستہ آہستہ سلطنتِ دہلی کا ''مشمولہ'' بن گیا۔ابوریحان کو ملتان میں نہ مندر ملا اور نہ ہی یہاں مترا کے بت کی کوئی نشانی موجود تھی لیکن جونہی ہندو مسلمانوں کے اثر ونفوذ سے آزاد ہوئے، انہوں نے مندر ایک بار پھر تعمیر کروالیا اور اس میں مترا کے بت کو ایک بار پھر سجا دیا۔ہندوستان کے طول وعرض سے ایک بار پھر زائرین ملتان میں آنے لگے اور ان کی حاجتیں پوری ہونے لگیں۔

مراکش کے الادریس 1130 عیسوی میں ''نزہت اُلمشتاق فی افتخار اُلافاق'' لکھی۔ یہ غزنی سلطنت کے انحطاط کا وقت تھا اور ملتان میں مہر پرستی عروج پر تھی۔ الادریس لکھتا ہے کہ مندر ملتان کے عین دل میں واقع تھا اور اس جگہ ہر وقت زائرین کا رش لگا رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے،'' مندر کی عمارت قُبہ نما ہے اور دورن طلائی ملمع کاری سے مزین ہے۔ اس مندر کا گنبد اور دروازوں کی تعمیر میں مقامی معماروں نے اپنی روحانی وابستگی اور خونِ جگر سے کام لیا ہے۔ مندر کے ستون کسی غیور شہزادے کی طرح سینہ تان کر کھڑے ہیں اور دیواریں دلہن کی طرح سجی ہوئی ہیں۔ ہندوستان بھر میں (ہندوسندھ میں) مترا کے بت سے زیادہ کسی اور بت کو واجب التعظیم نہیں سمجھا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ہندوستان کے ہر علاقے سے آئے ہوئے لوگ سارا سال موجود رہتے ہیں۔ لوگ اس بت کا قانون کی طرح احترام کرتے ہیں اور یہ مندر سارا سال یاتریوں کی جنت بنا رہتا ہے۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ مترا ان کا محافظ ہے اور اسی کی وجہ سے وہ قدرتی اور انسانی تباہی سے بچے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی ہمسایہ بادشاہ ملتان پر چڑھائی کا خیال دل میں لاتا ہے تو پروہت اور براہمن اسے سورج دیوتا کے غیض و غضب سے ڈراتے ہیں اور وہ اپنی تباہی کے ڈر سے تائب ہو جاتا ہے''۔

ادریس مراکشی ملتان کو ایک بہت بڑا شہر قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق یہ شہر منصورہ سے بھی بڑا شہر ہے اور اس کے دروازوں سے باہر ایک گہری خندق کھدی ہوئی ہے جو اس شہر کے لئے ہر دم بیدار پہرے دار کا کام کرتی ہے۔ ''اس شہر کے باسیوں کو حکومت نے بہت سی مراعات سے نوازا ہوا ہے لیکن انہیں بہت کم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ملتانی لوگ ہندوستان کے بہت سے دوسرے شہروں کے باسیوں کی نسبت فراخ دل اور خوشحال ہیں''۔ ادریس مراکشی بھی ملتان کو ''فراج'' ہی کہتا ہے۔

زکریا الخازونی جو کہ ''آثار البلاد و اخبار العباد'' کا مصنف ہے، ہندوستان میں اس وقت آیا (1263) جب یہاں خاندانِ غلاماں کی حکومت تھی۔ زکریا بھی ملتان کو ایک بہت بڑا اور ناقابلِ تسخیر شہر قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس شہر کا اوّلین محافظ ایک عالیشان قلعہ ہے جس پر نظر پڑتے ہی دشمنوں کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے،'' یہ شہر ہندوؤں کا روحانی قبلہ ہے اور ہندو اسے اسی طرح واجب التعظیم اور مقدس سمجھتے ہیں جس طرح مسلمان مکہ مکرمہ کو۔ یہاں مسلمان اور ہندو مل جل کر رہتے ہیں مگر عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے''۔ زکریا لکھتا ہے کہ اس شہر کی سب سے بڑی مسجد مترا کے مندر کے قریب واقع ہے۔

1205 عیسوی میں، جس وقت سلطان محمد غوری نے اپنے جسدِ فانی کو الوداع کہا، ملتان اور سندھ کا گورنر نصیر الدین قباچہ تھا۔ نصیر الدین قباچہ قطب الدین ایبک کا پسرِ نسبتی تھا اور اسی بنا پر سلطان محمد غوری کی وفات کے فوراً بعد سرکشی پر اتر آیا۔ اپنے مربی کی موت کے فوراً بعد اس نے سندھ اور ملتان کی خود انحصاری کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا۔ مرحوم بادشاہ کے لے پالک بیٹے، شمس الدین التمش، نے دہلی کا تخت سنبھالا اور 1217 کو ملتان پر حملہ آور ہوا اور نصیر الدین قباچہ کو شکست دی۔ سلطان التمش اس کی سرکشی سے اس حد تک نادم تھا کہ اس قباچہ کو دریائے سندھ میں پھینک دیا اور وہ ڈوب کر مر گیا۔ اس شکست اور موت کے ساتھ مسلمانوں کے زیرِ اثر ملتان کی آزادی کا دوسرا باب بھی بند ہو گیا اور ملتان ایک بار دہلی کو گود میں جا گرا۔

1396 عیسوی میں ملتان پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اس بار حملہ آور سلطان پیر محمد جہانگیر تھا۔ جہانگیر عالمگیر شہرت کے حامل جنگجو تیمور لنگ کا پوتا

تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی کا پایہ تخت محمد تغلق کے قدموں کی خاک چاٹتا تھا اور اس کا گورنر محمد خضر خان سرنگ خان سے شکست کھا کر ملتان چھوڑ چکا تھا۔ جب محمد تغلق کو یہ خبر ملی کہ مغل شہزادے نے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے اپنے نائب، محمد تاج الدین، کو شاہی فوج کے دستوں کے ساتھ ملتان روانہ کر دیا۔

پیر محمد دہلی کے دستوں کی آمد کا سن کر اپنی فوج کے ساتھ بیاس روانہ ہوا۔ اس کی فوج نے عین اس وقت ملتانی فوج پر حملہ کر دیا جب وہ پہاڑی نالہ عبور کر رہی تھی اور اس طرح بہت سی ملتانی سپاہ تلوار سے تو بچ گئی لیکن دریا سے نہ بچ سکی۔ جب سرنگ خان نے دیکھا کہ اس کی فوج کے ہزاروں جوان دریا میں ڈوب کر مر گئے ہیں تو اس نے اپنی فوجوں کو قلعے میں محصور ہونے کا حکم دیدیا اور مغل فوج ان کے تعاقب میں دوڑ پڑی۔ ملتان پہنچتے ہی سرنگ خان قلعے میں محصور ہو گیا۔ مغل فوج نے قلعے کا محاصرہ چھ ماہ تک جاری رکھا اور آخر کار خوراک کی عدم دستیابی کی وجہ سے ملتانی افواج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس طرح مرزا پیر محمد نے ملتان کا اختیار سنبھال لیا۔ (فریشتہ)

تیمور لنگ کی وفات کے بعد کا دور ہندوستانی بادشاہت کی چھتیس سالہ طویل سرما خوابی کا دور ہے۔ اس دوران میں ہندوستانی سلطنت کا نام اور وجود عنقا ہو جاتا ہے۔ اس دوران خضر خان تیمور لنگ کے نام پر مخنث صفت حکمرانی کا تجربہ کرتا ہے لیکن شاہی القابات کو، تاریخ کی طرح، اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ اسی دور میں ملتان میں ایک سرکشی سر اٹھاتی ہے اور لنگا افغان ملتان پر 1443 عیسوی میں دھاوا بول دیتے ہیں۔

اس کڑے وقت میں دہلی کا سلطان اخلاقی اور حکومتی زنجیروں سے آزاد ہو کر شہوت پرستی کو اپنا دھرم بنا لیتا ہے اور گداز اجسام کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ نتیجتاً سلطنت کا شیرزہ بکھر جاتا ہے اور ہندوستان میں ہر جانب سے بغاوتیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ کسی بھی والیِ سلطنت اور گورنر کی عدم موجودگی میں سارا ہندوستان مچھلی گھر بن جاتا ہے اور نظم و نسق کا یہ خلا سماجی ہیجان اور افراتفری کو جنم دیتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب سارا ہندوستان اندرونی اور بیرونی خوف جہنم بن چکا تھا۔ دیگر علاقوں کی طرح ملتان بھی اس تاریک دور میں لاقانونیت اور سماجی افراتفری کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

ایسے میں ملتان کے شرفاء کو، شیخ یوسف کی صورت میں، ایک امید کی کرن نظر آتی ہے۔ شیخ یوسف ملتان کے ایک خانقاہ کے سجادہ نشین تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری کے اعلیٰ معیارات کا سانسیں لیتا نمونہ تھے۔ شیخ صاحب کا تعلق قریش کے معتبر گھرانے سے تھا اور ان کے علم کا، طبقاتِ اکبری کے مصنف کے مطابق، ملتان بھر میں طوطی بولتا تھا۔ ملتان کے شرفاء کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں ملتان کی حکومت شیخ صاحب کے قدموں میں ڈال دی گئی۔

شیخ یوسف نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی، امراء کے مشورے سے، اصلاحات کا آغاز کیا اور مختصر عرصے میں ملتان کو ایک بار پھر دفاعی اور سماجی لحاظ سے ایک صحت مند ''ریاست'' بنا دیا۔ شیخ صاحب ہمسایہ حکومتوں میں امن کے سفیر کی حیثیت سے آتے جاتے رہے اور ملتان کی فضائیں ایک بار پھر خوشیوں کے گیتوں سے گونج اٹھیں۔ اسی دوران ایک فتنے کا جنم ہوا۔ شیخ صاحب سے وفاداری کا حلف لینے والوں میں لنگوں کا ایک سردار بھی تھا جو شیخ سے اس قدر محبت کا اظہار کرنے لگا کہ اس کی شہادت میں اس نے شیخ صاحب کو اپنا داماد بنا لیا۔ شیخ صاحب

کی شادی کی تقریب اس قدر شاندار تھی کہ سارا شہر عروسی لباس ملبوس نظر آ رہا تھا۔ تاہم شیخ کا پدرِ نسبتی آستین کا سانپ نکلا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اس نے شیخ کو دہلی بھجوا دیا جہاں سے وہ واپس نہ آ سکا اور شک کا بیج بو کر خود اقتدار پر قابض ہو گیا۔ یہ واقعہ 1445 عیسوی میں پیش آیا۔ غاصب نے اقتدار پر قابض ہوتے ہی شاہی انداز و اطوار اختیار کر لئے اور اپنے آپ کو سلطان قطب الدین لنگا کہنا شروع کر دیا۔ اس دوران شیخ یوسف سلطان بہلول لودھی کا مہمان رہا اور اس نے اپنی سلطنت واپس لینے کی کوئی کوشش نہ کی۔ قطب الدین لنگا کے بعد اس کا بیٹا حسین لنگا ملتان کا حکمران بنا۔ حسین لنگا ایک صاحب علم اور گہری دانش و بینش رکھنے والا متحرک حکمران ثابت ہوا اور اس کے توسیع پسندانہ معرکوں نے ملتان کو مغرب اور جنوب میں دور دور تک پھیلا دیا۔

ملتان میں لنگا خاندان اسی برس تک برسر اقتدار رہا اور اس دوران ملتان ہندوستان کو کندھار سے ملانے والے پل کا کام کرنے لگا۔ یہی دور ملتان میں خوشحالی کے نئے دور کا نقیب ثابت ہوا اور، ہندوستان کے ساتھ ساتھ، یہ شہر بھی زراعت اور تجارت میں بہت آگے نکل گیا۔ اسی دوران چناب اور گھارا کے کناروں پر موجود تمام زمینوں کو ہموار کیا گیا اور ان زمینوں کی کوکھ سونا اگلنے لگی۔ لنگا دور میں کچھ بلوچی اور جین قبائل کو بلوچستان اور کراچی کے سرحدی علاقوں میں آباد کیا گیا جو کہ اس دور کے سب سے بڑے تجارتی مراکز تھے۔

1526 عیسوی میں شاہ حسین ارغن، والیِ سندھ، نے بابر کے کہنے پر ملتان پر حملہ کیا اور فتح یاب ہونے کے بعد ملتان کی حکومت اپنے بیٹے، مرزا عسکری، کے سپرد کر دی۔ مرزا عسکری نے سلطان محمود لنگا کے ایک مضبوط امیر کی مدد سے بابر کے عہدِ حکومت میں ملتان پر حکومت کی اور اس دوران کسی سازش نے سر نہ اٹھایا اور نہ ہی ملتان کے باسیوں کو بیرونی حملوں کا کوئی ڈر رہا۔ بابر کی موت کے بعد ہمایوں کو اپنے بھائی، کامران مرزا، کی بالادستی کے آگے ہتھیار اور ملتان ڈالنا پڑا۔ کامران نے لاہور کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اپنے ایک امیر کو ملتان کا گورنر بنا کے لنگر خان کو لاہور طلب کر لیا۔ اس نے لنگر خان کا شاندار استقبال کیا اور اسے شہر کے قریب ایک رہائش گاہ فراہم کر دی جسے گزر لنگر خان کہا جانے لگا۔ (طبقاتِ اکبری)

کچھ عرصہ بعد کے واقعات نے ہمایوں کو سلطنت چھوڑ کر ایران جانے پر مجبور کر دیا اور ملتان پر بلوچی سردار، فتح خان، نے قبضہ کر لیا۔ جب شیر شاہ سوری کا دورِ حکومت شروع ہوا تو فتح خان نے سلطان سے وفاداری کا حلف اٹھایا لیکن شیر شاہ اس زرخیز علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے اپنے جرنیل ہیبت خان کی آنکھوں میں ملتان کی فتح کا خواب پرو کر بھیجا۔ فتح خان نے ملتان کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ مغل فوج کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا اور ملتان پر شیر شاہ سوری کا قبضہ ہو گیا۔ ہیبت خان نے ملتان کا نظم و نسق نہایت دانشمندی اور جوانمردی سے چلایا۔ شیر شاہ سوری اپنے اس جرنیل سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے ہیبت خان کو ''عظیم ہمایوں'' کا لقب دیا۔

1555 عیسوی ہمایوں کے ایک بار پھر برسر اقتدار آنے کا سال تھا تاہم کچھ عرصہ حکمرانی کے بعد اس نے عنانِ حکومت اپنے بیٹے، اکبر، کے سپرد کر دیا جسے تاریخ اکبرِ اعظم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ جس وقت برصغیر کا عظیم دانشور اور سیاسی مفکر، ابوالفضل، آئینِ اکبری کو قرطاسِ ابیض پر لا رہا تھا، ملتان ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ بن چکا تھا۔ اس دور میں اس عظیم اور قدیم شہر کی سرحدیں ایران تک پھیل چکی تھیں

اوراس نے بلوچستان، سندھ، شکارپور، سویستان، ٹاٹا اور لاہور کے دوآبوں کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ملتان میں شاہی دارلضرب (ٹکسال) بھی قائم کر دیا گیا تھا جہاں، دہلی، آگرہ، آلہ باد، کشمیر، اجین، سورات، پٹنہ اور ٹانڈا کے علاوہ تانبے کے سکے ڈھالے جاتے تھے اور جنگی سامان تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ قاضی القضات کا مسکن بھی یہی شہر تھا اور جب ہندوستان کے تمام اہل علم نے اکبر اعظم کو ''امام عدل'' قرار دیا تو اس وقت ملتان میں قیام پزیر قاضی القضات، قاضی جلال الدین ملتانی، نے بھی اس دستاویز پر دستخط کئے۔ خانِ اعظم مرزا عزیز، جو کہ اکبر اعظم کا رضاعی بھائی تھا، نے جب ''دین الہیٰ'' کو تسلیم کیا تو ملتان کو اس کی جاگیر بنا دیا گیا۔ مرزا عزیز اکبر اعظم کی آیا جی جی انگاہ کا بیٹا تھا اور اکبر اسی کے ساتھ پل کر جوان ہوا تھا اور موت تک اس کا والی رہا تھا۔ اکبر اعظم اکثر کہا کرتا تھا، ''میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کا دریا حائل ہے جسے میں کبھی عبور نہیں کر سکتا''۔

یورپی سیاحوں میں ملتان کا سب سے پہلا ذکر سینٹ ٹامس ہربرٹ کے سفرناموں میں شہزادہ خرم (جسے بعد ازاں شاہ جہاں کہا جانے لگا) کی بغاوت کے تناظر میں ملتا ہے۔ یہ دور اکبر اعظم کے بیٹے جہانگیر کی بادشاہت کا دور تھا، جس کے بارے میں مذکورہ سیاح لکھتا ہے،

''کشمیر میں جہانگیر نے اپنے طفلِ سیلانی کے کارناموں کی روداد کے ساتھ ساتھ ابراہیم کی موت اور سماجی افراتفری کی خبر سنی۔ اسے خوف تھا کہ اس کا من موجی بیٹا ہندوستان میں مقبول اور طاقتور ہو جائیگا۔ اسی خوف نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا اور اس نے اپنی جرنیل، چن جہاں، کو حکم دیا کہ وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ گجرات کی طرف پیش قدمی شروع کر دے اور باقی صوبوں، ملتان اور بکر، کی افواج کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے''۔

دوسرا یورپی سیاح فرانسیسی، ٹاوانیا ہے جو کہ ایک سیاح کے ساتھ ساتھ جواہرات کا ایک بہت بڑا تاجر بھی تھا۔ ٹاوانیا 1641 سے 1668 کے درمیانی عرصے میں ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کیا۔ وہ اصفہان کے راستے سے کندھار، کابل، لاہور اور دہلی سے ہوتا ہوا آگرہ پہنچا تھا۔ ٹاوانیا کی سیاحت اور تجارت کا دور اور شاہ جہان اور اورنگ زیب کی حکومت کا دور تھا۔ کندھار سے آگرہ پہنچنے کے لئے اس کے پاس دو راستوں کا انتخاب تھا؛ یا تو وہ کابل کے راستے سے پہنچ سکتا تھا یا پھر ملتان کے راستے سے۔ ملتان کے راستے کو اختیار کرنا اس لحاظ سے موزوں تھا کہ یہ راستہ دس دن پہلے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا تھا جبکہ دوسرا راستہ مقابلتاً طویل تھا۔ تاہم، ٹاوانیا لکھتا ہے، ''ملتان کا راستہ اختیار کرنا خطرات کو، یا پھر موت کو، دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ اس راستے سے وہی سفر کر سکتے تھے جو چار دن تک پانی پیئے بغیر زندہ رہ سکنے کی ناممکن شرط پر پورا اترتے ہوں؛ جبکہ ہمارے قافلے میں کوئی بھی آدمی اس جناتی صفت سے لیس نہیں تھا''۔ تاہم ان وہ اور اس کے ساتھی خطرات کے کھلاڑی ثابت ہوئے اور انہوں نے ملتان کے استے آگرہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹاوانیا آگے چل کر ملتان کے بارے میں لکھتا ہے، ''ملتان وہ شہر ہے جو کہ عمدہ چھینٹ (اصلی سوتی کپڑا جو ہندوستان سے درآمد کیا جاتا تھا) کافی بڑی مقدار میں پیدا کرتا ہے۔ اس کپڑے کو ہندوستان سے باہر اس وقت تک بھیجا جا سکتا تھا جب کہ دریاؤں کے منہ ریت سے بند نہ ہو جاتے۔ یہاں بڑے جہازوں کا رواج اس لئے نہیں تھا کہ بحری راستے ان کے لئے موزوں نہیں تھے۔ ملتان وہ شہر ہے جہاں سے تمام بنیے ایران کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سود کے کاروبار میں یہودیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک خاص قانون موجود ہے جو انہیں، خاص ایام میں، مرغ کا

گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے اور انہی ایام میں تین بھائی ایک بیوی کے ساتھ ہم بستری کی سہولت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس ایک بیوی سے ہونے والا بچہ بڑے بھائی کی ملکیت ہوتا ہے''۔

ٹاوانیا کے بعد 1666 میں ایک اور سیاح، ٹاوینات ہندوستان کا رخ کرتا ہے جسے مورخین ''پرمغز مشاہدہ کار'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ٹاوینات کی سیاحت کا دور اورنگزیب کا دور تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں خوشحالی اور امن میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس دور میں اورنگزیب معروف مرہٹہ شہزادے سیواجی کو دامِ تزویر میں لانے کی کوششوں میں مصروف تھا، ملتان میں مہر پرستی ابھی تک جاری تھی اور مندر پر یاتریوں کا میلہ لگا رہتا تھا جو دور دراز سے اپنی آتما کو تسکین دینے کے لئے پیدل سفر کرتے اور قیمتی نذرانے سورج دیوتا کو پیش کرتے۔ ٹاوینات نے سورج دیوتا کو سرخ چمڑے میں ملبوس دیکھا۔ اس وقت اس بت کا رنگ کالا تھا اور آنکھوں میں قیمتی یاقوت جگمگا رہے تھے۔ یہ غالباً اورنگزیب کی جفاکیشی سے قبل کا دور تھا۔ بعد میں اورنگزیب نے اپنی ہندو رعایا پر مظالم کی انتہا کر دی اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا۔

1738-39 عیسوی میں نادر شاہ کے حملے کے دوران ایک افغان، زاہد خان، کو دہلی کے ایک وزیر، قمر الدین، کے اسرار پر ملتان کا وائسرائے بنا دیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے 1818 عیسوی میں ملتان پر حملہ کیا اور زاہد خان کے چھ پوتوں کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ اس کے بعد ملتان کو شیوخ نے اپنے قبضے میں لے لیا اور پھر انگریزوں کے قبضے، 49-1848, تک ملتان پر انہی کی حکمرانی رہی۔ برطانوی ہر کاروں نے آخری شیخ گورنر مل راج، کا کورٹ مارشل کیا اور اسے موت کی سزا سنائی جس میں تخفیف کر کے جلاوطنی کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔ مل راج معروف شیخ دیوان ساون مال کا پوتا تھا اور اس پر ایک انگریز سیاسی ایجنٹ، وانس ایگنیو، کے قتل کا الزام تھا۔ جلاوطنی کی سزا سنائے جانے کے بعد اسے کلکتہ بھیج دیا گیا اور اس نے باقی زندگی وہیں گذاری۔

جنرل کنیگہم نے 1853 عیسوی میں ملتان میں سورج دیوتا کے مندر کا دورہ کیا اور اس کا جغرافیہ وہی بتایا جو استخاری، ابن حاؤقل اور ادریس نے بتایا۔ وہ بتاتا ہے کہ مندر اور بت کو اورنگزیب کے دور میں تباہ کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کر دی گئی تھی۔ جب شیوخ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اسی مسجد کو بارود گھر میں تبدیل کر دیا جو 1849 کے محاصرے کے دوران ایک دھماکے سے پھٹ پڑا اور مسجد راکھ کے کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ تاہم اس دور میں بھی کاسیاپا کا مشہور مندر بہاؤالحق کے دربار شمال مشرقی زاویے پر موجود تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کاسیاپا کا اصل مندر پرہالد نے خود تعمیر کروایا اور اس مندر کی چھت بھی 1849 کے دھماکے میں اڑ گئی تھی۔ تاہم عین اسی مقام پر ہر سال سالانہ میلہ لگا کرتا تھا جس کا مقصد نارسنھ اوتار کی یاد تازہ کرنا ہوتا تھا۔

برنیز اپنے بخارا کے سفرناموں میں لکھتا ہے کہ ملتان کے نواب مظفر خان نے ایک دیوار منہدم کروائی جس نے اس شہر کے کئی تاریخی پہلوؤں کی عمارت استوار ہو گئی۔ اس کھدائی کے دوران ساٹھ فٹ کی گہرائی پر ایک طبلِ جنگ پڑا ملا۔ اس کے بعد جنرل کنیگہم نے کئی بوسیدہ دیواریں گرا دیں اور اس سے ملتان کی قدامت اور عظیم تاریخ کے کئی مخفی پہلوؤں پر روشنی پڑی۔ پنتالیس سے پچاس فٹ کی گہرائی پر راکھ، جلی ہوئی مٹی اور کئی ایسے شواہد ملے جو مقدونیہ کے عظیم فاتح سکندرِ اعظم کے ''عظیم'' کارناموں کا پتہ دیتے تھے۔ ان آثار سے ظاہر ہوا کہ

سکندر کی فوج نے کس قدر خون ریزی کی اور خون کی کتنی ندیاں بہائیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کی فوج نے مالی کے جوانمردوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔

آریان اور سترابوؤں کے مطابق سکندر اعظم کو ملتان میں جنگ کے دوران گہرا زخم آیا جو بعد ازاں اس کی موت کا باعث بنا۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت مالی کا قلعہ گردونواح کے تمام قلعوں کی نسبت مضبوط قلعہ مانا جاتا تھا لہذا لوگ قطار اندر قطار اس قلعے میں داخل ہونے لگے۔ جنرل کنیگہم اس مضبوط براہمن شہر کو، جس پر سکندر اعظم نے چڑھائی کی، اطاری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ شہر ملتان کے شمال مشرق میں 34 میل کے فاصلے پر تلمبہ کی شاہراہ پر موجود تھا۔ بلاشبہ، اس دور میں، ملتان بالائی صوبہ پنجاب کا دارالحکومت تھا اور ان علاقوں کا سب سے مضبوط قلعہ اسی شہر میں واقعہ تھا۔ سکندرِ اعظم کی لشکر کشی کے وقت اس شہر کے پچاس ہزار سپوتوں نے اس شہر کے دفاع کے لئے جنگ لڑی۔ مشہور یونانی فلسفی اور مورخ آریان (Flavius Arrianus) اپنی مشہور کتاب (Anabasis) میں لکھتا ہے کہ، ''مالی کے جنگجو باسی دوسرے قصبوں کو چھوڑ کر اپنے شہر کے دفاع کے لئے ایک جگہ جمع ہو گئے''۔ سکندرِ اعظم کے بارے میں یہی مورخ کہتا ہے کہ اس نے براہمن شہر سے مالی پر دو مرتبہ چڑھائی کی۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ براہمن شہر، اطاری، ملتان سے چونتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی بنیاد پر جنرل کنیگہم کہتا ہے، ''میں اپنی اس بات پر پراعتماد ہوں کہ سکندر کے دور کے مالی کا دارالحکومت موجودہ شہر ملتان ہی تھا''۔ میجر رینل کہتا ہے کہ ملتان پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے نسبتاً بلندی پر واقع تھا جبکہ تلمبہ کے نزدیکی کھنڈرات یہ بتاتے ہیں کہ یہ 'شہر صدر مقام' کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم زیادہ تر سیاح اور جغرافیہ دان جنرل کنیگہم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر بیان کی جاتی ہے کہ براہمن شہر اور اُچ کو فتح کرنے کے بعد، سکندر نے مالی کا شہر عبور کیا اور یہ شہر دریا سے 30 میل کے فاصلے پر موجود تھا۔

مشہور برطانوی محقق، سیاح اور سیاست کار (ڈپلومیٹ) سر الیگزینڈر برنز (Sir Alexander Burnes) اپنی مشہور کتاب ''بخارا کے سفر'' (Travels into Bokhara) کی تیسری جلد میں لکھتا ہے، ''میں اس چیز کو ضروری نہیں سمجھتا کہ ہم قدیم دارالحکومت کی تلاش میں جدید شہر ملتان کو نظر انداز کر کے ایسے شہر کی تلاش کریں جس کا مطالعہ صرف آثارِ قدیمہ کے ماہرین ہی اپنے قیاس کی عینک سے کر سکتے ہوں۔ اگر ہم قدیم شہر کی ہی تلاش میں ہیں تو ملتان پر نظر پڑتے ہیں ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کے قدیم تمدن کا گڑھ رہا ہے''۔

جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہندو اساطیر کا کاسیاپا پورہ، کاسیاپا سے مشتق ہے جو کہ ہندو صنمیات میں ایک اہم ترین دیوتا کی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ان سات دیوتاؤں میں سے ایک تھا جو آکاش پر دبِ اکبر (بڑا ریچھ) کی شکل میں موجود ہیں۔ علم الاصنام کے ماہرین کے مطابق یہ سات دیوتا، یا رشی، سات آسمانی دیویوں کرتقاس (Krittikas، جو یونانی دیومالائی دیویوں Pleiades سے ملتی جلتی ہیں۔ Pleiades مشہور یونانی دیومالائی دیوتا Titan Atlas کی سات بیٹیاں تھیں) سے ملاپ کرتے ہیں۔ مقامی ریتوں اور روایات کے مطابق وشنو (اہم ترین ہندو معبود جس کی ایک پالنے والے اور پروان چڑھانے والی طاقت کے طور پر پوجا کی جاتی ہے) نے ملتان میں نارسنھ کی حیثیت سے، کاسیاپا کے دور میں، جسمانی ملبوس میں ظہور پایا۔ یہ اسطورہِ عتیق (Ancient Myth) ملتان کی عہدِ عتیق میں

اہمیت پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالتا ہے اور اس سے اس شہر کی مذہبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جنرل کنیگہم (Sir Alexander Cunningham)، جو ہندوستان میں آثاراتِ عتیق کی دریافتوں میں پیش پیش رہے اور ان کی 1871 میں شائع ہونے والی مشہور و معروف کتاب (The Ancient Geography of India) ہندوستانی آثار قدیمہ پر اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، کو 73-1872 میں ملتان کی کھدائی کے دوران کچھ چاندی کے سکے ملے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قدیم سکے ملتان میں مہر پرستی کے عروج کے دور میں ڈھالے گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سکے چچ کے دور سے قبل کے ہیں۔ یہ دور ساتویں صدی عیسوی کا دور تھا جب ملتان پر دواہج کی حکومت تھی جس نے اپنے دور میں مہر پرستی کا بامِ عروج پر پہنچایا تھا۔

ایلفن سٹون (ایک برطانوی سرکاری افسر جس نے 1841 میں ہندوستان کی تاریخ پر کتاب بھی لکھی) نے اس قسم کا پہلا سکہ دریافت کیا اور اس کے اس کام میں جنرل کورٹ اور جنرل وینٹیورا بھی شامل تھے۔ یہ ایک سہ انداز تکونی سکہ تھا جس پر ایک بادشاہ کے جسم کا بالائی حصہ کندہ تھا جس پر ایک شیر کا سر بنا ہوا تھا۔ اس سکے پر لاؤنی (Scythic) حروف میں ایک مختصر تحریر کندہ تھی جسے اس زمانے میں کوئی بھی پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ تاہم اس سکے کے کناروں پر دیوناگری رسم الخط میں ایک تحریر درج تھی جسے نہ صرف پڑھ لیا گیا بلکہ زبانِ فرنگ میں ترجمہ بھی کر دیا گیا جس کے معانی یہ طے پائے: ''شیر دل سمراٹ دیواجارتا؛ خوش بخت شاہِ فارس و ہند''۔ اس سکے کی پشت پر ایک دیوتا کا نقش کندہ ہے جسے جیمز پرنسپ، ہندوستانی نوآبادیوں کا منتظم اور پہلا دانشور جس نے اشوکِ اعظم کے احکامات کی رمز کشائی کی، ایرانی دیوتا متراقرار دیتا ہے جبکہ کنہنگم کے نزدیک یہ نقش ادتیا کا ہے۔

جیمز پرنسپ کے مضامین (Essays on Indian Antiquities, Historic, Numismatic, and Palaeographic) کے نام سے، دو جلدوں میں، 1858 میں شائع ہوئے جن میں ہندوستانی تاریخ سے وابستہ کئی رموزہ تحریروں کو اسرار کی تہہ سے پاک کرنے کے بعد شائع کیا گیا۔ اوپر بیان کئے گئے سکوں کے حوالے سے اگر کنہنگم کی بات مان لی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ سکے 500 عیسوی میں ڈھالے گئے تھے۔

دوسرا سکہ پہلے سکے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور یہ مشہور ایرانی حکمران خسرو پرویز کا ہم عصر ہے۔ اس پر ایک بادشاہ کی شبیہہ کندہ ہے جس نے سر پر پروں سے بنا ہوا تاج پہنا ہوا ہے اور اس کے حاشیے پر پہلوی تحریر درج ہے۔ اس سکے کی پشت پر ہندوستانی سورج دیوتا کی تصویر بنی ہوئی ہے اور حکمرانی کا 37 واں سال درج ہے جو کہ 626 عیسوی بنتا ہے۔ یہ سکہ اس حوالے سے خصوصی دلچسپی کا متقاضی ہے کہ چچ نامہ میں بیان کردہ ایرانی حملے اور راجہ سہارس، جو کہ برہمن چچ کا پیش رو تھا، کی شہادت دیتا ہے۔ کنہنگم کا خیال ہے کہ یہ سکہ خسرو پرویز نے ہندوستان میں اپنی عارضی فتوحات کے اعزاز میں بنوایا تھا۔

تیسرا سکہ دوسرے سکے سے بہت قریبی تعلق کی روشن شہادت ہے اور ظاہری طور پر دوسرے سکے کی طرح ہی لگتا ہے۔ جناب ٹامس نے اس سکے پر موجود پہلوی تحریر کی رمز کشائی کی تو یہ تحریر سامنے آئی، ''منصفِ منصفاں شوورا شو، براہمن شاہِ ملتان''۔ اسی سکے کی پشت پر سورج دیوتا کی وہی شبیہہ موجود ہے جو باقی دو سکوں پر پائی گئی ہے اور حاشیے سے ایک طرف ''سری واشو، واشودیوا'' اور دوسری طرف ''پنچائی

زوُلستان‘‘ کے الفاظ موجود ہیں۔

جیسا کہ اوپر کے بیانات سے ظاہر ہے، آخری سکے پر ملتان کا لفظ واضح طور پر موجود ہے اور سکے کی پشت پر موجود سورج دیوتا (ادتیا یا مترا) کی تصویر ہے جو انڈو ایرانی اساطیر میں روشنی کے دیوتا مانے جاتے ہیں۔ کنہنگم واس دیوا کو راجہارا قرار دیتا ہے جو چچ سے قبل ملتان کا حکمران تھا اور چچ نے ملتان کو اس سے چھین لیا تھا۔ راجہارا شسی کا رشتہ دار تھا اور ایک صاحب ثروت اور اہل دانش حکمران سمجھا جاتا تھا۔ چچ نامہ کے مطابق اس کا بھتیجا، ساہیوال، ملتان کے بالمقابل سقا کا حکمران تھا۔ ساہیوال نے اپنے چچازاد، اجری، سے مل کر تین ماہ تک بیاس کے کناروں پر چچ سے جنگ کی تھی۔

ملتان میں مہر پرستی کے حوالے سے دوسری اہم جگہ، ’’سورج کنڈ‘‘ ہے جو 1848 کے محاصرے کے دوران لیفٹیننٹ ایڈورڈ اور لیک کی قیادت میں ایک انگریز چھاؤنی کا کام دیتی رہی ہے۔ یہ جگہ شاہراہِ بہاولپور پر ملتان کے جنوب میں واقع ہے اور دورِ قدیم میں ہندوستان کے چند مقدس مقامات میں سے ایک تھی۔ اس مقام پر واقع حوض کا 132 فٹ کی گولائی میں ہے اور 10 فٹ گہرا ہے۔ شیخ دیوان، ساون مال نے اس حوض کے گرد ایک مثّمن (ہشت ضلعی) دیوار تعمیر کروائی تھی۔ مہر پرستی کے دور میں یہ جگہ بھی زائرین کے لئے سرچشمہِ فیض و برکات تصور کی جاتی تھی اور یہاں سال میں دو میلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک میلہ بھادوں کی سات تاریخ کو خصوصاً اس وقت لگتا تھا جب چاند گھٹ رہا ہوتا تھا اور دوسرا اسی تاریخ کو ماگھ کے مہینے میں لگتا تھا۔ ساتویں تاریخ اس ہندو دیومالا کی تعظیم ہے کہ سورج دیوتا کا رتھ (ارابہ) سات گھوڑے کھینچتے ہیں؛ یا پھر، ایک اسطورہ کے مطابق، سات تاریخ منوں کے سات بیٹوں (سات رشیوں) کی تعظیم میں ان روحانی اجتماعات کے لئے وقف کر دی گئی تھی جو کہ ملتان کے اوّلین مئوسس (بانی) قرار دیے جاتے ہیں۔

جدید ملتان ایک بہت بڑے ٹیلے پر واقع ہے۔ یہ ٹیلہ ماضی کا خاموش لیکن بلیغ استعارہ ہے جس کے اندر صدیاں محوِ خواب ہیں۔ شہر ایک تین میل لمبی فصیل کی چادر میں لپٹا ہوا ہے؛ تاہم اور مشرقی شہروں، شیراز، اصفہان، کابل، کی طرح، اس کے چاروں جانب مضافاتی قصبوں کا ایک ہجوم موجود ہے۔ مضفاتی آبادیوں کے گرد فصیل موجود نہیں ہے اور اسی لئے چینی سیاح، ہوان ژانگ، نے ملتان کو پانچ میل کی فصیل کے اندر موجود شہر قرار دیا تھا اور اسی قسم کا ایک بیان ایلفن سٹون بھی اپنی کتاب (Elphinstone's Kabul) کے 27 ویں صفحے پر دیتا ہے۔ جب اس نے ملتان کا دورہ کیا تو اس وقت اس شہر کے گرد حفاظتی خندق موجود نہیں تھی۔ تاہم ماہ راجہ رنجیت سنگھ کے فعال گورنر ،ساون مال، نے اس شہر کے گرد گہری اور کشادہ خندق تعمیر کروائی اور راروی کے پانیوں سے روابط کے زرائع بھی قائم کئے۔ ملتان کی دیواریں اس وقت تعمیر کی گئیں جس وقت مراد بخش، شاہ جہاں کا چوتھا نوجوان پوتا، 1627 عیسوی میں ملتان کا وائسرائے بنا۔ یہ شہزادہ اسلحے کا شوقین تھا اور اپنے فارغ اوقات میں شیروں اور ریچھوں کا شکار کیا کرتا تھا جن کا اس وقت ملتان کے جنگلوں پر راج تھا۔

ملتان کا قلعہ نصف مثّمنی (ہشت پہلو) عمارت ہے جس کی گولائی سوا میل (6,600 فٹ) ہے۔ شروع میں اس شہر کی فصیل کے چھیالیس بُرج تھے اور ہر چار دروازوں کے فاصلے پر ایک قلعہ بند مینار موجود تھا۔ الادرسی نے بارھویں صدی کے اوائل میں ملتان کے بارے میں لکھا، ’’یہ قلعے کے اندر موجود ایک بہت بڑا شہر ہے جس کے چار دروازے ہیں اور اس کے ادر گرد حفاظتی خندق موجود ہے‘‘۔ قلعے کے ابھی

تک چار دروازے ہیں؛ شمالی دروازہ کے نام خضری دروازہ ہے اور اسے ملتان کے گورنر، سید خضر خان نے تیمور کے دور میں یہ نام دیا تھا۔ شہر کے مغرب کی جانب ''دی'' اور جنوب میں ''راہری'' دروازہ ہے جبکہ مشرق میں سِقی دروازہ موجود ہے۔ دی دروازہ دیوال کے تبرک خانے، جس میں سورج دیوتا کی مورتی موجود تھی، کی وجہ سے اس نام سے مشہور ہے اور کنہگم کے نزدیک یہ عین اسی مقام پر موجود ہے جہاں اسے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دروازہ زائرین کو سیدھا سورج دیوتا کے چرنوں میں لے جاتا تھا اور شہر میں موجود ایک بہت بڑا نالہ بھی اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا جو کہ مندر سے نکل کر شہر کی سڑکوں تک آتا تھا۔

سِقی دروازہ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قدیم قلعہ بند شہر سِقا کی نسبت سے رکھا گیا تھا جس کا ذکر عرب اور سندھ کے مورخین کرتے ہیں۔ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ملتان کے قلعے کو عرب مورخین ''سقا ملتان'' کہا کرتے تھے۔ ویون ڈی سینٹ مارٹن کا ملاستھانی پورہ اور ہوان ژنگ، کشمیرین مورخین کی سند کے مطابق، مقامی اسلوبِ کلام کے زیر اثر ملتان بن جاتا ہے جو کہ ابوریحان کے ملا ثانہ سے بہت قریب ہے۔

سنسکرت زبان میں 'ملا' کے معانی ''جڑ، مادہ'' کے ہیں اور 'ستھان' علاقے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ملتان میں مہر پرستی کے ضمن میں دیدہِ مہر نور کا سرچشمہ ہے اور ایک مستند شاستر، امرا کوشا، میں سورج کو ورادھنا کہا گیا ہے جو کہ سنسکرت لفظ ملا کا متبادل ہے۔ اس طرح ملا ثانہ، ملاٹانہ کا مطلب سورج کا مندر بنتا ہے۔ یہ پروفیسر ولسن کا نظریہ ہے جس کی جنرل کنہگم نے بھی اپنی کتاب قدیم جغرافیہ میں توثیق کی ہے۔

منشی حکم چند تواریخ ضلع ملتان کے صفحہ 42 میں لفظ ملتان کی تلاش قدیم ہندو دیومالا اور سنسکرت زبان میں کرتا ہے۔ حکم چند لکھتا ہے ''ہندوؤں کے مطابق ''ست جُگ'' میں ہران کِشاب راکشل اور پراہلاد بھگت رہا کرتے تھے۔ اس دور میں لوگ لفظ ملتان کے ماخذ کو یوں بیان کیا کرتے تھے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے آباد ہونے والا مُل کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے اس شہر کو ملتان کہا جانے لگا۔ دوسرا یہ کہ سنسکرت زبان میں مُل کے معنی ''آغاز'' کے ہیں۔ چونکہ یہ شہر انسانی آبادکاری کے اوّلین دور میں آباد ہوا تھا، اسی لئے سب سے پہلے اسے ''مُل ترنگ'' کہا جانے لگا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ملتان بن گیا۔ تیسرا یہ کہ سنسکرت میں مُل کا مطلب ''مرکز'' لیا جاتا ہے اور ستھان ''جگہ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شہر چونکہ یہ ہندوستان کے وسط میں آباد ہوا، اسی لئے اسے ملستھان کہا جانے لگا''۔

فریشتہ ملتان کی جڑیں سامی اساطیر میں ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک ملتان کی بنیاد رکھنے والے حضرت نوح کی اولاد میں سے تھے اور ان لوگوں نے اس شہر کو آباد کرنے والے سردار کے نام پر اس شہر کا نام ملتان رکھا۔ دوسرے مسلمان مورخین کے نزدیک یافص بن نوح سیلِ عظیم (طوفانِ نوح) کے بعد کافر ہو گیا تھا اور اس شہر میں آن بسا تھا۔ حنس، جس کا تعلق یافص کی اولاد سے تھا، ایک بہت بڑا راجہ بنا اور اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی جو اس کے نام کی نسبت سے حنس پور کہلانے لگا۔ یہ شہر پانچ سو سال تک قائم رہا اور اس کے بعد قانونِ تنزل کی لپیٹ میں آ گیا اور وقت میں تحلیل ہو گیا۔ اگلے پانچ سو سال کے دوران یہ شہر وقت کے ہاتھوں پامال خرابے کا منظر پیش کرتا رہا جب تک کہ راجہ بھگت کشن نے اسے از سرِ نو آباد کیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ شہر ایک بار پھر انسانی آبادکاری سے محروم ویرانے میں تبدیل ہو گیا اور ایک بار پھر اسے

آباد ہونے میں پانچ صدیاں لگیں۔ تاہم یہ شہر ایک مرتبہ پھر آباد ہو گیا۔ اس مرتبہ اسے آباد کرنے والا راجہ شام پرم ناتھ تھا اور اسی نسبت سے اسے شام پور کہا جانے لگا۔ چند ایک صدیاں آباد رہنے کے بعد اس شہر کو دریا بہا لے گیا اور محض ایک چھوٹا سا قلعہ اس غرقابی کے سامنے سینہ سپر رہا اور دریا اس کی بہادری کے اعتراف میں قدم بوسی کے بعد واپس چلا گیا۔

اس سیلِ اصغر کی واپسی سے چند ایک صدیاں بعد راجہ مور اس علاقے میں شکار کی غرض سے داخل ہوا۔ راجہ مور کو یہ علاقہ اس حد تک پسند آیا کہ اس نے یہاں شہر آباد کیا اور اس کا نام، اپنے نام کی نسبت سے، ''مورتران'' رکھا۔ مورتران بعد میں ''مُولتران'' اور پھر اسلوبِ بیان کے زیرِ اثر ''مولتانہ'' یا پھر ''مولتان'' بن کر رہ گیا۔ ایڈورڈ ٹامس کے مطابق قدیم سکوں پر محض لفظ ''ملتان'' درج ہے۔ اس لفظ میں موجود علم ہجا سے متعلق تفاوت بصری ہے سمعی نہیں ہے۔ تاہم جس وقت شاہ گردیز یوسف نے جب اس شہر کا دورہ کیا تو قلعہ سلاسلِ روز و شب کی نذر ہو چکا تھا اور اس کی تاسف انگیز نشانی کے طور پر مٹی کا ایک بہت بڑا ٹیلہ موجود تھا۔

موجودہ شہر، جزوی طور پر، اسی مقام پر موجود تھا جہاں کسی دور میں دریا بہا کرتا تھا اور بعد میں اس کے بائیں کنارے پر بھی آبادکاری ہونے لگی۔ دریا شاہ یوسف کے مقبرے کے ساتھ بہا کرتا تھا۔ جدید شہر کی بنیاد آٹھ سو سال قبل رکھی گئی تھی جس وقت راوی شہر کی دیواروں کے ساتھ شمال مغرب کی جانب بہا کرتا تھا۔ دریائے راوی کے قدموں کے نشان آج تک اس شہر سے اسکی پرانی دوستی کی یاد دلاتے ہیں جبکہ دریا اس وقت پانچ سے چھ میل دور دیوانوں کی سی مستی میں، شہر کے مغرب میں، محوِ سفر ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قدیم شہر، جدید شہر کے مشرقی پہلو میں واقع تھا اور بعد میں جنوبی ملتان مولا موج کے دریا برد کے ارد گرد آباد ہونے لگا۔ لوگوں کا خیال اس طرف اس لئے جاتا ہے کہ موجودہ شہر کے مشرق اور شمال میں دور دور تک کھنڈرات اور ٹیلے موجود ہیں۔ سکندرِ اعظم کی لشکر کشی کے دوران یہ شہر جنوب میں واقع تھا اور اس نظریے کی حمایت کرنے والوں میں کنہگم جیسے مستند محقق بھی شامل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سکندر نے لشکر کشی کا آغاز مشرق سے ملتان پر حملہ کر کے کیا۔ ملتان کے علاقے میں موجود کھنڈرات سورج کند کی سمت جاتے ہیں اور پھر دور تک پھیل جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شہر میں قانونِ عروج و زوال نے کئی مرتبہ اپنا کھیل کھیلا اور ملتان کا سفینہ قلزمِ وقت میں ابھر ابھر کر ڈوبتا اور ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ اس بات کی تصدیق اس زبان زدِ عام شعر میں بھی ملتی ہے؛

حنس پور، بھاگ پور، شام پور چوتھا پور ملتان
پنچون پور، بھاج کرتھی یا ہری پور سلطان

یہ شعر، جہاں تک فصیل کے اندر موجود شہر کا تعلق ہے، ملتان کی تاریخ کے حوالے سے بیان کردہ اس روایت سے ملتا ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ تاہم، منشی حکم چند کے ماننے والوں میں سے، بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ملتان دریائے راوی کے دونوں کناروں پر موجود تھا۔

ملتان شہر کے حوالے سے یہ بیانات ابتدائی عرب مورخین اور جغرافیہ دانوں کے بیانات کے عین مطابق ہیں جنہوں نے ملتان کا دورہ کیا اور

اس کے بارے میں اپنے سفرناموں میں لکھا۔ یہ تمام مورخین اور سیاح سقا ملتان کو ملتان کے مشرق میں دریائے راوی کے کناروں پر موجود پاتے ہیں۔ جنرل کننہگم بھی، کم وبیش، اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں، ''سقا ملتان کا قلعہ تقریباً اسی جگہ موجود ہوگا جسے آج ہم سیتل ماڑی کہتے ہیں۔ اسی مقام پر کسی دور میں، ملتان سے دو میل دور، دریائے راوی بہتا تھا۔(Ancient Geography p. 238)

مسلمانوں نے اپنے اگلے بارہ سو سالہ دور کے دوران اصنام پرستی اور ہندو دھرم کے ہر نشان کو ملیا میٹ کر دیا اور جنرل کننہگم مسلم دور سے قبل کی باقیات کی تلاش میں کئی کنوئیں کھودنا پڑے۔ 1864 میں، پہلاد پوری کے مندر کے قریب، ایک چالیس فٹ گہرا کنواں کھودا گیا جس کے دلچسپ نتائج سامنے آئے۔ اس تلاش کا مقصد مٹی کے بہت بڑے ڈھیر کے سینے میں موجود مدفون ماضی کے سربستہ رازوں کو کھوجنا اور اس کی قدامت کا اندازہ لگانا تھا۔ کھدائی کے دوران، دس سے بارہ فٹ کی گہرائی میں معاذ الدین کے کعباد کے دور (89-1286) کے سکے، ایک صیقل شدہ مٹی کا نیلا دیا اور کئی نیلے رنگ کے برتن برآمد ہوئے۔ یہ شہادت اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ برصغیر میں مٹی کے صیقل شدہ برتنوں کا استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ اس طرح دس فٹ کی کھدائی جنرل کننہگم کو چھ سو سال ماضی میں لے گئی اور وہ ہر آدھ فٹ کے بعد ایک صدی ماضی بعید میں جانے لگا۔ بارہ فٹ کی گہرائی پر وہ سمانتا دیوا (950-900) کے دور کی باقیات پر اپنی نظریں جمائے کھڑا تھا اور اس طرح بارہ فٹ کھدائی اسے مزید نو سو سال پیچھے لے گئی تھی۔ چودہ فٹ کھدائی پر اسے 13*6/1.5 کی اینٹیں ملیں اور سترہ فٹ پر دو فٹ گہری سرخ راکھ اس کی منتظر نگاہوں کی منتظر تھی۔ اٹھارہ فٹ پر، چھ سے نو انچ گہری کالی راکھ اور 11*6*2 کی اینٹیں جو مزید کھدائی پر بڑی ہوتی گئیں۔ چونکہ مغلوں کے قد چھوٹے تھے، وہ چھوٹی اینٹیں بناتے تھے، پٹھان اس سے بڑی اور بدھ زیادہ طویل القامت ہونے کی وجہ سے زیادہ بڑی اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ تیس سے بتیس فٹ کی گہرائی پر راکھ اور جلی ہوئی مٹی کے علاوہ ریشم بننے کا گولا، چمار کی سان اور سکوں سے بھرا ایک برتن موجود پایا گیا جس میں 200 کے قریب سکے موجود تھے۔ چھتیس سے انتالیس فٹ پر خالص مٹی موجود تھی جس کی بزرگی کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

اس آثاریاتی کھدائی (حفریات) کے نتیجے میں ماضی کے دو اہم رازوں کے پردے چاک ہوتے ہیں؛ ہم دو مختلف گہرائیوں پر راکھ کے ڈھیر پاتے ہیں۔ پندرہ سے اٹھارہ فٹ کی گہرائی پر سرخ راکھ کے ذخائر پائے گئے جن پر کالے راکھ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ یہ راکھ اس کنوئیں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ راکھ کی اس گہرائی پر موجودگی محمد بن قاسم کے حملے کے دور کی ہے جس کی رحم دل فوج نے ایک پوری چھاؤنی کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ راکھ اور جلی ہوئی مٹی کا دوسرا ذخیرہ تیس سے بتیس فٹ کی گہرائی پر ملتا ہے اور یہ سکندرِ اعظم کی فوج کی سیاہ کاریوں کی سیاہ نشانی ہے۔ تاریخ کے مطابق اس علاقے میں سکندر کو جنگ کے دوران مہلک زخم لگا تھا جس پر مقدونیہ کی فوج برافروختہ ہوگئی اور قلعے کے محاصرے کے دوران وسیع اور بے امتیاز خون ریزی کرنے لگی۔ جنرل کننہگم کا خیال ہے کہ راکھ مقدونیہ کے ''مہذب'' سپاہیوں کی نشانی ہے جب انہوں نے خورشید وار خون ریزی کے بعد شہر کو آگ لگا دی تھی۔

اگر ان پر لکھی تحریر پڑھی جا سکتی تو ایک برتن میں ملنے والے سکے بھی ایک عظیم دریافت کہے جا سکتے تھے۔ یہ سکے چوکور تھے اور جزوی طور پر مٹی کی خوراک بن جانے کی وجہ سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ یہ نتائج ملتان کی قدامت اور شاندار تاریخ کے بہت بڑے ثبوتوں میں سے

ہیں اوران کا تعلق تاریخِ عالم کے ایک عظیم ڈرامے سے بھی بنتا ہے جس کا ڈراپ سین ملتان میں ہوا۔ان کنوؤں میں پائے جانے والے ہندونوادرات میں ان گنت پتھر کی انگوٹھیاں اور موتی شامل ہیں جنہیں مقامی زبان میں منکا یا نعل کہا جاتا ہے۔ان مالاؤں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ،سب سے پہلے آنے والے مسلمان، غازیوں اور شہیدوں کے اعزازات تھے جن کے ساتھ انہیں شہرِ خموشاں میں سلایا جاتا تھا۔اسی قسم کے پتھر ہڑپہ میں پائے گئے ہیں جہاں پارہ پارہ ماضی کی کرچیاں پائی گئی ہیں اوراسی قسم کے پتھر حرم گیٹ کے نزدیک کھدائی میں بھی ملے تھے۔

تاہم ملتان کی سب سے اہم اور حیران کن امتیازی خصوصیت مقابر اور مساجد کے ملبے ہیں جو کہ ملتان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اوران کی تعداد لاہور میں موجود انباروں سے زیادہ ہے۔ان انباروں کو مقامی اسلوبِ کلام (سرائیکی زبان) میں ''بھِڑ'' یا ''ٹھیا'' کہا جاتا ہے۔یہ بھِڑ ملتان کے گردونواح میں چاروں طرف موجود ہیں اوران میں اینٹوں کے علاوہ ٹوٹے ہوئے برتن اور گھریلو استعمال کی اشیاء عام طور پر نظر آتی ہیں۔اس قسم کے بھِڑوں کا شمار بہت مشکل ہے لیکن چند اہم کی تفصّل قارئین کو کتاب کے آخر میں ملے گی۔یہ بھڑ علم عتیقیات کا ذوق رکھنے والوں کے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں ماضی کے ان ابواب کو کھولنے کی کلیدوں کے مدفن ہیں جن پر وقت نے قفل لگا دیے ہیں۔اگر شعبہِ آثاریات ان پر توجہ دے تو ان کی کھدائی ہمیں اپنے مستند ماضی سے روشناس کرا سکتی ہے۔

فصیل کے اندر موجود شہر کے چھ دروازے؛ دہلی دروازہ، دولت دروازہ، لاہوری دروازہ، بوہڑ دروازہ، حرم دروازہ پاک دروازہ ہیں۔ان میں سے بوہڑ دروازہ مغرب کی جانب لے جاتا ہے جبکہ دہلی دروازہ جنوب کی طرف۔دورِ عتیق میں چار اور دروازے بھی موجود تھے جو کہ مرکزی قلعے کی طرف لے کر جاتے تھے لیکن انہیں بعد میں مسمار کر دیا گیا تھا۔شہر کی دیواریں نواب علی محمد خان خاکوانی نے 1156 عیسوی میں تعمیر کروائی تھیں۔یہ دیواریں بہت بلند تھیں لیکن انگریز دور میں صحت کاری کی مہم کے دوران انہیں چھوٹا کر دیا گیا۔

ملتان کے ہندو ماضی کے باوجود یہاں ہندو یا عہدِ عتیق کے آثاریات میں دلچسپی رکھنے والے کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ملتان میں کوئی ایسے آثار موجود نہیں جن سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ کسی دور میں ہندو ثقافت نے اس شہر میں عروج دیکھا تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس شہر کو جامع شکست سے دوچار کیا اور ہر اس نقش باقیہ یا سراغ کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر مٹا دیا جو اس شہر کے حقیقی مئوسسین کی ثقافت اور دھرم کی یاد دلاتا تھا۔تاہم سورج کنداب بھی ایسا مقام ہے جو ہندو جاتریوں کے لئے ایک ایسے مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے جو انہیں ہندوستان کے طول وعرض سے کھینچ لیتی ہے۔

نارسنگ پرانہ کے مطابق راجہ حرن کشاب ست جُگ میں ملتان میں مقیم ہوا۔حرن کشاب کو ہندو کافر قرار دیتے تھے۔اس راجہ کے ایک بیٹے کا نام پرہلاد بھگت تھا۔ایک دن اس کے باپ نے دیکھا کہ وہ پرم وشنو کی پراتھنا کر رہا ہے اور رام نام کی مالا پھیر رہا ہے۔اس کے باپ، راجہ حرن، نے اسے مجبور کیا کہ وہ خدا کی عبادت کرنے کی بجائے اس کی عبادت کرے۔یہ بات ذہن میں رہے کہ ہندو اساطیر کے مطابق حرن کشاب کو برہما (براہ مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی پانا یا ایکا یک نمودار ہونا ہے) وچن دیا تھا کہ وہ امر ہوگا اور اس پر کوئی بد دعا، ہتھیار، زہر اور جانور اثر نہیں کریگا۔برہما نے اسے یہ بھی رعایت دی تھی کہ زمین، پانی اور آگ دن اور رات کے دوران اس پر کوئی اثر نہیں

کریں گے۔ جب حرن کشاب کو امر ہونے کا احساس ہوا تو وہ فخر سے پھول گیا اور اس نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اسے خدا مانتے ہوئے سجدہ کیا کریں۔ پرہلاد کو بھی حکم تھا کہ وہ اپنے باپ کی پوجا کرے۔ تاہم اس پر اپنے باپ کی سختی کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے پرم وشنو کی پوجا شروع کر دی جو مسلسل اسے اپنی طرف پکار رہا تھا۔ راجہ نے اپنے بیٹے پر مظالم کی انتہا کر دی لیکن پھر بھی وہ اپنی راہ پر قائم رہا۔ آخری حربے کے طور پر راجہ نے ایک سونے کا ایک ستون تعمیر کروایا اور اسے آگ سے گرم کرنے کا حکم دیا اور پرہلاد کو اس سے باندھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پرہلاد جل کر راکھ ہو جائے گا اور اسے اسکی نافرمانی کی سزا مل جائیگی۔ جب اس خدا پرست نوجوان کو ستون سے باندھ دیا گیا تو نارسنھ، اوتار، ایک شیر کی صورت میں، اس ستون سے ظاہر ہوا اور فوراً دھات کو ٹھنڈا کر دیا۔ کشاب کے تکبر اور مظالم پر نارسنھ جی کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے کشاب کا پیٹ چاک کر دیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ سب کرنے کے بعد اوتار غائب ہو گیا۔ پرہلاد کی موت کے بعد اس کے نام کا مندر سونے سے تیار کیا گیا۔ اس مندر کے ستون بھی سونے سے تیار کئے گئے تھے جنہوں نے سونے کی چھت کو اپنے سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ یہ روایت مزید بتاتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد، کسی نامعلوم وجہ کے تحت، یہ مندر زمین میں دھنس گیا اور اس کی جگہ نیا مندر تعمیر کر دیا گیا۔ اس نئے مندر میں وہی ستون نصب کیا گیا جس سے نوجوان پرہلاد کو باندھا گیا تھا۔

یہ ہے وہ قدیم روایت جو پرہلاد کے مندر کی تعمیر اور اس کہن سال شہر کی ابتدائی ''تاریخ'' بیان کرتی ہے۔ اس کہانی کا حرن کشاب دراصل حرانیا کاسیاپا ہی ہے جسے سنسکرت شاستر کاسیاپاپورہ کا مئوسس قرار دیتے ہیں جس کا نام بعد میں ملتان پڑ گیا۔ کاسیاپاپورہ ملتان کا وہ قدیم ترین نام ہے جو ابوریحان البیرونی، دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت میں، اپنے سفرناموں میں بیان کرتا ہے۔

1849 کے بارودی دھماکے نے اس مندر کی چھت کو اڑا دیا اور پھر یہ مندر کئی سال تک ویران پڑا رہا۔ کئی عرصہ بعد باوا رام داس نے اس مندر کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ اس مندر کی تعمیر کے اخراجات، گیارہ ہزار روپے، مخیّر حضرات نے برداشت کئے۔ ہم سورج کند کے محلِ وقوع پر پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ سورج کند کا حوض اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ پرہلاد کا مندر۔ ہندو شاستروں کے مطابق، جب اوتار حرن کشاب کو مار ڈالا تو اس کا غصہ تمام حدود فراموش کر چکا تھا۔ جب دیوتاؤں نے یہ دیکھا تو اس کے غصے کی آگ کو بجھانے کے لئے اسے سورج کند کے حوض پر لے گئے جہاں تمام دیوتاؤں نے اس عظیم ہستی کے ساتھ اشنان کیا۔ ان دیوتاؤں میں سورج دیوتا بھی شامل تھا جس نے اس شہر اور سورج کند کو بہت پسند کیا۔ جب تمام دیوتا آرام کرنے کے بعد واپس چلے گئے تو لوگوں نے اس عظیم موقع کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اس مقام پر ایک کنواں کھودا۔ جب کنواں کھودا جا چکا تو سورج جی مہاراج نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور خوشی کے عالم میں گویا ہوئے، ''جو کوئی بھی اس حوض میں غسل لے گا، اس کے تمام گناہ معاف کر دیے جائینگے اور وہ دنیا اور آخرت میں کامیابی پائے گا''۔ سورج دیوتا کی آواز ماننے والوں کے ایمان کو متحرک کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس واقعے کے بعد ہندوستان بھر سے عقیدت مندوں اور مقلدین کی بہت بڑی تعداد ہر سال مخصوص موسم میں اس حوض پر حاضر ہونے لگی۔ اس حوض کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اس کے پانی سے نہانے سے نا صرف انسان جنموں کے چکر (آواگون) سے نکل جاتا ہے بلکہ اس کا پانی تمام جسمانی زخموں کے ساتھ ساتھ روحانی زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ پہلے بیان کئے گئے سالانہ میلوں کے ساتھ ساتھ عورتیں اور مرد اس مقام پر ہر جمعہ اور اتوار کے دن اکٹھے ہوتے تھے۔ سورج کند کے علاوہ ہندو

دیومالا کے مطابق ملتان میں اہمیت کے حامل دوسرے مقامات یہ ہیں؛

مندر نرسنپوری:

ہندو تریمورتی میں وشنو خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وشنو کی تجسیم صفتی کے بعد، جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، نارسنھ جی قلعے میں اس کے تخت پر جا بیٹھے اور مقلدین کو قلعے میں داخل ہونے کے سلسلے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس مشکل کے پیش نظر باوا رام داس پجاری نے شہر میں ان کا ایک بت نصب کر دیا اور آٹھ سال بعد دیوتا کو ایک مندر بنا کر نصب کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس مقام پر، چیت کے مہینے میں، ایک بہت بڑا میلہ لگنے لگا اور ہزاروں لوگ اس میں شرکت کرنے کے لئے آنے لگے۔

طولہ مائی کا مندر:

کہا جاتا ہے کہ حرم دروازے کے قریب ایک بہت بڑا کُہن سال مندر ہوا کرتا تھا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ مندر اس وقت جواں سال تھا جب نارسنھ اوتار شیر کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ جب اورنگزیب، جس کی زندگی کا مقصد اپنی تمام ہندو رعایا کو مسلمان کرنا اور ہندوستان سے بتوں کو ختم کرنا تھا، نے ہندوؤں کو شدید اذیتیں دیں۔ دیوی جی، ہندو کتب کہتی ہیں، ننگے پاؤں چل کر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ اس کنوئیں کے مقام پر بعد میں ہندوؤں نے مندر تعمیر کر دیا جس میں شدتِ غم سے دیوی نے چھلانگ لگا دی تھی۔ مندر کی تعمیر کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس مندر کو بھی مسمار کر دیا جائے اور، رواج کے مطابق، اس کی جگہ مسجد تعمیر کر دی جائے۔ اس واقعے سے چند روز بعد بادشاہ کا بیٹا شدید بیمار پڑ گیا اور اس کا علاج اس مندر کے سجادہ نشین، کالیان داس، نے کیا جو کہ علمِ طب میں بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اورنگزیب نے اس طبیب کی خدمات کے صلے میں مندر کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی اور دیوی جی کی شبیہہ کو ملتان میں نصب کر دیا گیا۔ یہ وہ کہانی ہے جو کہ ہندو مندر کی مسماری اور دوبارہ تعمیر کے بارے میں سناتے ہیں۔ تاہم یہ کہانی اس لئے بھی نا قابل یقین ہے کہ اورنگزیب جیسا تنگ نظر اور اسلام سے کورانہ وابستگی رکھنے والا حکمران کبھی مندر کی تعمیر کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ڈیوڈ روز اپنی کتاب ''پانچ دریاؤں کی زمین اور سندھ'' (The Land of Five Rivers & Sindh) کے صفحہ 101 پر لکھتا ہے کہ اورنگزیب نے اپنے دورِ حکومت میں ایک لاکھ ہندوؤں کو، ملتان میں، مذہبی تعصب کی بنا پر قتل کروایا اور ہندوستان بھر میں ہزاروں مندروں کی جگہ مساجد تعمیر کروا دیں۔

جوگ مایا کا مندر:

ملتان شہر سے ایک میل دور، نارسنھ جی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تمام دیوتا اکٹھے ہوئے اور اس موقع پر جوگ مایا دیوی نے بھی اس محفل کو رونق بخشی۔ وہ جگہ جہاں وہ سب سے پہلے اتری، زائرین کے لئے جنت بن گئی اور اس جگہ دیوی جی کا مندر قائم کر دیا گیا۔ بعد میں

اس مندر کو جوگ مایا کا استھان کہا جانے لگا۔اس دیوی کا اصل نام ''جوت مایا'' ہے کیونکہ ہندی زبان میں لفظ 'جوت' روشنی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعد میں اس مندر پر بیلوں اور بھینسوں کی قربانی کی جانے لگی اور اس نسبت سے یہ مندر جوت مایا کا مندر کہلائے جانے کی بجائے جوگ (پنجابی میں بیل اور بھینس جوگ کہلاتے ہیں) مایا کا کہا جانے لگا۔موجودہ مندر کی تعمیر پر دس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اور اسے دیوان ساورن مُل نے تعمیر کروایا تھا۔

رام تیرتھ کا مندر:

یہ مندر ملتان سے ایک میل دور مشرق میں واقع ہے۔اس مندر میں ایک دھرم شالا، ایک پختہ حوض اور عمارت گنج بھی موجود ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ راجہ رام چندر (شری رام چندر کے والد جو دھیا گنگا کے شمال میں کوشل کی عظیم سلطنت کے حکمران تھے)، رامائن کا بطلِ جلیل، بن بانس کے سفر پر ایک فقیر کے روپ میں ملتان آیا اور کچھ عرصہ اسی شہر میں رہا۔تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ شری رام کی داستان (رامائن) غیر انسانی دیو مالائی واقعات پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایشور کی طرف سے ہدایت دینے والے رہنما کی داستان ہے جس میں ایسی حکومت کا نمونہ پیش کیا گیا ہے جو نیکی، انسان دوستی اور محبت و امن کا گہوارہ تھی۔اسی نسبت سے ملتان ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس شہر سمجھا جاتا ہے اور رام چندر کے سفر کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اس شہر میں ایک حوض تعمیر کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس حوض میں نہانا گنگا میں اشنان کرنے کے برابر ہے۔اس حوض کے گرد پختہ سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور اس حوض کی تعمیر پر بیس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔پُرنماشی (پورے چاند کی رات) کے موقع پر، یا پھر ہر سال بھادوں کے مہینے میں، اس مندر پر ایک عظیم الشان میلہ لگا کرتا تھا۔

بدھلہ سنت کا سمادھ:

یہ سمادھ موضع دُرگانہ میں، ملتان سے پندرہ میل مشرق میں موجود ہے۔اس سمادھ میں نہ صرف ایک دھرم شالا موجود ہے بلکہ مسافروں کے لئے پانی کی ایک بہت بڑی سبیل اور مسافر خانہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔اس سمادھ کی تعمیرِ نو میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، خاص طور پر سبیل اور مسافر خانہ اس عظیم حکمران نے پچھتر ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کروایا تھا۔بکرمی (نئے سال کا پہلا دن) کے موقع پر یہاں ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے جہاں ملتان، مظفر گڑھ، منٹگمری، جھنگ اور بہاولپور سے بیس ہزار سے زائد لوگ شریک ہوتے ہیں۔

یہ مقدس مقام بدھلہ بھگت کی یادگار ہے جس کا اصل نام بدھو (عاقل) تھا۔وہ مخدوم پور میں باٹی (weighman) کا کام کیا کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ ایک بار جب وہ مکئی کا وزن کر رہے تھے ایک فقیر ان کی دکان میں حاضر ہوا۔بُدھو اس وقت انیسواں بار کر رہے تھے اور وہ اونچی آواز میں ''انیس، انیس'' (کُل اُنی ہے) کی گردان بھی کرتے جا رہے تھے۔کُل اُنی ہے (سرائیکی اسلوبِ کلام) کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ ''وہ ایک ہی ہے''۔یہ الفاظ خدا کی قدرتِ کاملہ اور ہمہ جائیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس فقیر نے یہ سن کر کہا، ''کیا تم دنیوی انیس (اُنی) کا راگ ہی الاپتے رہو گے یا پھر حقیقی اُنی کی بھی خبر لو گے''۔فقیر کے یہ الفاظ نیکوکار اور عاشقِ حق بُدھو کے دل میں اتر

گئے اور وہ کچھ عرصے بعد خود بھی فقیر بن گیا۔اس کے دوستوں اور رشتہ داروں نے اسے خوب سمجھایا کہ وہ دوبارہ اپنا کاروبار سنبھال لے لیکن وہ ایک تیاگی کے طور پر زندگی گذارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔اس نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنایا اور حیاتِ نفسانی کو خیر آباد کہہ کر عارف بن گیا۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب لوگ اسے جنگل سے واپس لینے جاتے تو وہ اپنی ہڈیوں کو توڑ کر علیحدہ کر لیتا اور لوگ ڈر کر واپس آ جاتے ۔ایک رات جب وہ جال کے درخت کے نیچے سو رہا تھا تو معجزانہ طور پر غائب ہو گیا اور بعد میں اسی درخت کے ساتھ اس کا سدھ (مقبرہ) بنا دیا گیا۔

جب بھی ہندو یا مسلمان اس کے مقبرے کی زیارت کے لئے جاتے ہیں تو انہیں کھانے کے لئے گوشت لے کر جانے کی اجازت نہیں ہوتی ۔کہا جاتا ہے کہ جب حوض تعمیر کیا جا رہا تھا تو ایک مسلمان معمار نے ایک بھیڑ کو ذبح کیا اور اپنے دوستوں کو کھانے کی دعوت دے دی۔ان میں سے تیرہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تاہم زندہ بچ جانے والے ''رام،رام'' کی مالا جپ رہے تھے۔

رام چوترہ کا مندر:

یہ خوبصورت مندر دریائے راوی کے کنارے،سرائے سدھو پانچ کوس شمال مشرق میں،ایک باغ میں واقع ہے۔اس مندر کو بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تعمیر کروایا تھا اور اس پر بارہ ہزار روپے لاگت آئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ جب رام چندر (رامائن کا ہیرو)،اپنے معروف سفر کے دوران،ملک کے اس حصے میں آیا تو لکشمن اور سیتا بھی اس کے ساتھ تھے۔اس موقع پر رام چندر نے اپنے کپڑے اتارے اور دریائے راوی میں غسل کرنے لگے اور لکشمن اور سیتا پوجا میں مشغول ہو گئے۔جس جگہ پر سیتا نے عبادت کی وہ جگہ سیتل کند کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جہاں رام چندر نے اپنے کپڑے اتار کر غسل کیا وہ جگہ ''رام چوترہ'' کہلانے لگی اور جس جگہ پر لکشمن عبادت میں مشغول تھا وہ جگہ ''لکشمن چوترہ'' کے نام سے مقبول ہوئی۔

اکبرِ اعظم کے دور میں سیتا نند سوامی،بیراگی قبیلے کا ایک تیاگی،بندرہ بن سے ملتان آیا اور اس نے یہاں ایک ''ٹھاکر دوآرہ'' تعمیر کروایا۔ اس موقع پر اس وسیع القلب شہنشاہ نے اسے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے زمین بھی عطا کی اور ادارے کی دیکھ بھال کا بھی انتظام کر دیا۔ بیساکھی کے موقع پر اس مقام پر ایک بہت بڑا میلہ لگا کرتا ہے جس میں گردونواح کے اضلاع سے جوق در جوق لوگ اپنی روحانی ذات کے حکم پر یہاں آتے ہیں اور سیر ہو کر جاتے ہیں۔یہ مقام دیکھنے کے قابل ہے۔دونوں طرف دریا نے اس مقدس مقام کو گھیرا ہوا ہے اور اردگرد بے شمار برگد اور شیشم کے درخت،تھکے ہوئے مسافروں کی خدمت کے لئے،موجود ہیں۔اس مقام کی سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پہنچے پر تقریباً دس میل تک دریا بالکل سیدھا بہتا ہے اور کسی من موجی کی طرح ادھر اُدھر راستہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا جبکہ اس مقام سے پہلے اور بعد کی زمین دریا برد ہوتی رہتی ہے۔ہندو اس بات کا یہ جواز پیش کرتے ہیں:

''جب رام چندر جی دریا میں غسل فرما رہے تھے،ان کی بیوی دس میل دور اسی دریا کے کنارے پر موجود تھی۔جب اس نابغہ روزگار نے اپنی بیوی پر نظر ڈالی تو دریا اس طرح سیدھا ہو گیا جیسے تیر کی پرواز بالکل سیدھی ہوتی ہے اور رام چندر آسانی سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا''۔ہندو دیو

مالا کے برعکس اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر زمین انتہائی سخت اور مضبوط ہے اور اسی لئے دریا کے سیلانی اور ہر جائی ذوق سے محفوظ ہے اور سیلاب کے دور میں بھی محفوظ رہتا ہے۔

نوگزوں کے مزار:

ملتان میں مسلمانوں کی تعمیر شدہ عمارات بھی اس شہر کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں اور علم الاثار کے ماہرین کو اس شہر کی جانب کھینچتی ہیں۔ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ''نوگزوں'' کے مقابر ہیں۔یہ نوگزے ابتدائی مسلمانوں کے ساتھ ملتان آئے تھے اور ہندوؤں کے ساتھ جنگ میں مارے گئے تھے۔جنرل کنہنگم ملتان میں اس قسم کے پندرہ مزارات کا ذکر کرتا ہے جو چار گز سے ساڑھے چون فٹ لمبے ہیں۔ان میں سے ایک مقبرہ دہلی دروازے سے باہر پیر غور سلطان کے مزار کے قریب ہے جو ساڑھے پینتیس فٹ لمبا ہے۔اس مقبرے پر چاکلیٹی رنگ کا پتھر لگا ہوا ہے۔اس پتھر کی موٹائی ساڑھے نو انچ ہے اور اس میں نو انچ گولائی میں ایک سوراخ بھی موجود ہے۔اس پتھر کو منکا کہا جاتا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بزرگ اس پتھر کو اپنی گردن میں ڈالا کر پھرا کرتے تھے۔کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پتھر ان کی ان کی انگوٹھی (چھّلا) تھا۔کہا جاتا ہے،اور بعض ماہرین کا اندازہ بھی یہی ہے،کہ یہ مقبرہ تیرہ سو سال پرانا ہے۔جنرل کنہنگم کا خیال ہے کہ اس قبر میں دفن شخص محمد بن قاسم کے ساتھ ملتان آیا ہوگا اور پھر جنگ کے دوران ہندوؤں کے ہاتھوں مارا گیا ہوگا۔

مسجد علی محمد خان:

اس مسجد کی عمارت نہایت خوبصورت ہے جسے نواب علی محمد خان خاکوانی نے 1757 عیسوی میں تعمیر کروایا تھا جب وہ عالمگیر کے دور میں والی ملتان ہوا کرتے تھے۔یہ مسجد چوک بازار میں،شہر کے عین وسط میں موجود ہے جسے گدڑی بازار بھی کہتے ہیں۔اس مسجد میں وضو کرنے، نہانے اور رفع حاجت کرنے کا بہترین انتظام موجود ہے۔اس مسجد میں نماز ادا کرنے کا کمرہ خاصا بڑا اور کشادہ ہے۔اس مسجد کی آمدنی کا انحصار اس دوکان پر ہے جو اس کے ساتھ موجود ہے۔اس دوکان کی ماہانہ آمدنی بیس سے پچیس روپے ماہانہ ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر سے عین اسی مقام سے دریا گذرتا تھا اور اس کی رفتار اس قدر تیز ہوتی تھی کہ انسانی حیات اور املاک کو خاصا نقصان پہنچتا تھا۔جب دریا نے اپنا رخ تبدیل کیا تو یہ مقام بیلا (جنگل،ویرانہ) بن گیا اور یہاں خونخوار شیروں نے بسیرا کر لیا۔جب اس جگہ کو آباد کیا گیا تو یہاں مجرموں کو سزائیں دی جانے لگیں اور ایک کوتوال قائم کر دیا گیا۔

علی محمد خان خاکوانی نے اسی جگہ پر مسجد تعمیر کروائی اور یہ مسجد نظام کی کچہری یا دربار کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی جبکہ اس کے بڑے ہالوں میں گرو گرنتھ صاحب (سکھوں کی مقدس کتاب) رکھی جاتی تھی۔برطانوی دور کے آغاز پر اس مسجد کو دوبارہ مسلمانوں کے سپرد کر دیا گیا۔

مسجد کے دروازے پر موجود فارسی تحریر کا ترجمہ یہ ہے:

''اللہ اور آخر الزماں نبی کے فضل و کرم سے؛ اور ہر دو جہاں میں قابلِ احترام جیلانی بزرگ کی عنایت سے۔ اس مقام پر شر کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے مجرموں کو سزا دی جاتی ہے۔ اس مسجد، حوض اور حماموں کو ملتان کے گورنر نے تعمیر کروایا۔ ایک غائبی آواز نے اس کی تعمیر کا حکم دیا اور علی محمد خان نے ۱۱۷۱ ہجری میں اسے تعمیر کروایا''۔

اس طرح یہ منظوم فارسی کتبہ، آخری مصرعہ میں، اس مسجد کی تعمیر کے سال کا بھی پتہ دیتا ہے اور بنانے والے کا نام اور عہدہ بھی بتاتا ہے۔

مسجد پھلاں ہٹاں آلی:

یہ مسجد ملتان کے چوک بازار میں واقع ہے اور اسکی تعمیر کا سہرا ہندوستان کے بادشاہ فرخ سیر کے سر ہے جس کا دورِ حکومت 1713 سے 1718 عیسوی تک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ نے ملتان کا دورہ کیا تو وہ بے اولاد تھا۔ اس نے ایک فقیر سے التجاء کی کہ وہ اس کے لئے دعا کرے۔ فقیر نے بادشاہ کے لئے دعا کی اور خدا نے ملکہ کو ایک بیٹا عطا کیا۔ فرخ شاہ کو اپنے بیٹے کی پیدائش پر اس قدر خوشی ہوئی کہ اس نے ملتان کے گورنر کے توسط سے اس فقیر کو اسی ہزار روپے کا انعام دے بھیجا اور اس آزاد فقیر نے اس رقم سے یہ مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد کو پُھل (پھول) ہٹھاں والی مسجد اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس جگہ پر گُل فروش پھول بیچا کرتے تھے۔

عیدگاہ:

یہ عالیشان مسجد قلعے کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ انگریز لفٹیننٹ وانس اگنیو اور اینڈرسن، 94-1848 میں ملتان کے محاصرے کے دوران اسی عیدگاہ میں چھپے رہے اور انہیں یہیں گھیر کر قتل کیا گیا۔ عیدگاہ کی لمبائی 250 فٹ اور چوڑائی 50 فٹ ہے اور اسکی اینٹوں سے بنی ہوئی دیواریں چوڑی ہیں۔ اس عمارت کے سات گنبد ہیں جن میں سے سب سے بڑا مرکز میں واقع ہے جسے کے گرد چھوٹے گنبد مقلدین کی طرح موجود ہیں۔ عیدگاہ کی مغربی دیوار پر ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر انگریزی میں یہ تحریر کندہ ہے:

''اس عمارت کے اندر، 19 اپریل 1848 کو پیٹرک وانس اگنیو (بنگال سول سروس) اور ولیم اینڈرسن (بمبئی کا پہلا فیوزل) کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا''۔

مسجد کی تعمیر، نواب عبدالصمد خان کی نگرانی میں، 1735 عیسوی میں مکمل ہوئی۔ یہ محمد شاہ کا دور تھا اور نواب اس وقت ملتان کے گورنر تھے۔ برطانوی دور کے آغاز پر یہاں عدالت لگا کرتی تھی تاہم بعد میں اسے مسلمانوں کے سپرد کر دیا گیا اور انہیں پابند کیا گیا کہ وہ مغربی دیوار پر لگی ہوئی تختی نہیں اتاریں گے۔

مسجد بکر آباد:

یہ مسجد ایک گاؤں طرف جمعہ کشالا کے احاطے کے اندر ملتان کے مشرق میں موجود ہے اور اسے، ملتان کے نواب، بکر علی خان نے مغل دور میں تعمیر کروایا تھا۔ دیوان ساورن مال کی وائسرائے شپ کے دوران اس مسجد کو قرآن پر حلف برداری کی تقریبات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

عام خاص باغ:

جب شہزادہ مراد بخش ملتان کے والی تھے تو وہ عوام وخواص کو اس جگہ سے خطبات دیا کرتے تھے اسی نسبت سے اسے عام خاص باغ کہا جاتا ہے۔ مراد بخش اسی مقام پر لوگوں کی شکایات سنتے اور افسران کو حکم نامے جاری کرتے یا زبانی احکامات پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیوان ساورن مال بھی اسی مقام پر اپنا دربار لگایا کرتے تھے۔ ساورن مال نے یہاں ایک بارہ دری بھی تعمیر کروائی تھی جو ابھی تک موجود ہے۔ یہ عمارت ایک خوبصورت باغ کے اندر موجود ہے جس میں دیوان نے برگد اور پیپل کے سایہ دار درخت لگوائے تھے۔ ان سایہ دار درختوں کے نیچے لوگ آرام کیا کرتے تھے۔ بعد میں اس عمارت کو تحصیل کورٹ کے طور پر بھی استعمال کیا جانے لگا تھا۔

شیش محل:

شیش محل نواب مظفر خان نے آج سے اسی برس قبل (جب مصنف کتاب تحریر کر رہا تھا) اپنی رہائش گاہ کے طور پر تعمیر کروایا۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جس نے شیشوں کا عروسی لباس پہنا ہوا تھا۔ بعد میں لوگوں نے اس کے گہنے اتار لئے اور حکومتوں نے اسے نظر انداز کر دیا اور عمارت سرکاری دفتر کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

شیخ محمد یوسف کا مقبرہ:

یہ مقبرہ فصیل شہر کے قریب، گردیزی محلّہ میں موجود ہے۔ یہ مقبرہ تیس فٹ اونچی چوگوشہ (چوکور) عمارت میں موجود ہے۔ مقبرے کی تعمیر میں صیقل شدہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں جن پر خوبصورت رنگوں کی پالش بھی کی گئی ہے۔ مقبرے کی چھت پتھر کے کٹاؤ کا آرائشی کام بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے تاہم چھت کی حاشیہ کاری خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ مقبرے کے جنوب میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے جس امام بارہ (امام بارگاہ) کہا جاتا ہے۔ اس امام بارگاہ کی تعمیر پر اسی ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ شمال کی جانب ایک منارچہ موجود ہے جس کے اندر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پائے مبارک کا نقش موجود ہے۔

اس مقام پر دفن شدہ بزرگ گردیز میں (450 ہجری) پیدا ہوئے تھے جو اپنی پرہیز گاری، تقویٰ اور کرامات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ یہ بزرگ 481 ہجری (1088 عیسوی) میں ملتان آئے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک بار اپنے دادا

سید محمد عبداللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص روتا ہوا ان کے دادا کے پاس آیا۔ اس شخص کا بیٹا شدید بیمار تھا اور وہ اس کے لئے سید محمد عبداللہ سے دعا کروانا چاہتا تھا۔ سید عبداللہ نے دعا کرنے سے انکار کر دیا اور اس شخص کے بیٹے کی موت واقع ہوگئی۔ جب لوگ اسے قبرستان لے کر جا رہے تھے تو شیخ یوسف نے گریہ زاری اور چیخوں کی آواز سنی تو اسے لڑکے کے والدین پر ترس آ گیا اور وہ ان کی زندگی کے لئے دعا کرنے لگے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ مردہ لڑکے میں جان پڑ گئی اور وہ فوری طور پر اٹھ بیٹھا۔ اس کرامت پر سید محمد عبداللہ کو اپنے پوتے پر اس قدر غصہ آیا کہ انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ شیخ محمد یوسف مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے مسعود دوئم کے دور (531 عیسوی) میں ہندوستان آن پہنچے اور وصال کے بعد عین اس جگہ دفنا دیے گئے جہاں وہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے۔

شیخ یوسفؒ سے منسوب ہزاروں کرامات زبان زدِ عام ہیں۔ تاہم اس کرامت کا ذکر ان کے مزار کے باہر لگی ہوئی تختی پر بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملتان کے قریبی جنگل میں ایک خونخوار شیر آ کر بس گیا جس سے لوگوں کو شدید پریشانی لاحق ہوگئی تھی اور کئی لوگ اس آدم خور کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ ایک دن سب لوگ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی روحانی طاقتوں کے بل بوتے پر انہیں شیر سے نجات دلائیں۔

شیخ یوسفؒ فوراً جنگل کی طرف روانہ ہوئے جہاں شیر گھات لگائے بیٹھا تھا، لیکن شیر کی جونہی حضرت پر نگاہ پڑی وہ پالتو بلی کی طرح ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ بزرگ شیر کی پیٹھ پر سوار ہوئے اور گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ ایک سانپ ان کے سامنے آ گیا اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگا۔ شیخ یوسفؒ نے اس سانپ کو پکڑ لیا اور اسے چابک کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ملتان آ گئے۔

ملتان میں قیام کے دوران شیخ یوسفؒ کے مقلدین کی تعداد روبروز بڑھتے بڑھتے ہزاروں میں ہوگئی۔ مسلمان مقلد شیخ کو اپنا روحانی ہادی قبول کرتے وقت اس کے ہاتھ پر بیعت لیتے ہیں اور مکمل سپردگی اور عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر قرآن کریم کی کچھ مقدس آیات بھی تلاوت کی جاتی ہیں اور یہ تقریب فاتحہ خوانی پر ختم ہوتی ہے۔ شیخ یوسفؒ کے حوالے سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی ان کے تقویٰ اور کرامات کی شہرت سن کر، ان کی موت کے وقت مرید بننے کی غرض سے، دور دراز علاقے سے ملتان آیا۔ ملتان پہنچ کر اسے خبر ملی کہ کشش کا وہ مرکز جو اسے ہزاروں میل سے کھینچ کر لایا تھا محبوبِ حقیقی کے پاس جا پہنچا ہے تو اسے دلی صدمہ ہوا۔ وہ فوراً آپؒ کے مقبرے پر گیا اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگا۔ اسکی عقیدت اور محبت میں اسقدر اخلاص تھا کہ حضرت کا دست شفقت مقبرے سے باہر آیا اور اس سچے عاشق نے فوراً بیعت کر لی۔ اس مقبرہ میں آج بھی ایک سوراخ موجود ہے اور ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت آج بھی اپنے سچے چاہنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے مقبرے کے اوپر درج فارسی اشعار کا ترجمہ پیش ہے:

''کیا تم اس شیر کے سوار سے واقف ہو جس نے سانپ کو اپنا چابک بنا لیا۔ وہ مخدوم شیخ یوسفؒ تھے جو یہاں دفن ہیں۔ دینا کی ہر چیز اڑا دینے والا طوفان بھی روحانیت اور پاکیزگی کی اس شمع کو نہیں بجھا سکے گا جو انہوں نے روشن کی۔ ان کا سنِ وفات ان کا نام، شیخ یوسف

(462) بتاتا ہے اور تاریخِ وفات شاہ گردیز (557) سے ظاہر ہے''۔ تاہم اس شعر میں دی گئی دونوں تاریخیں غلط ہیں جبکہ درست تاریخوں کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

تاہم ملتان اور سندھ کے سب سے مشہور بزرگ حضرت بہاؤالحقؒ ہیں جن کا عظیم الشان مزار ملتان کی سب سے بڑی نشانی بن گیا ہے جسے کئی میلوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نام کا ورد بہت بڑے نواب، ملاح، کسان اور ریڑھی بان، ہمہ وقت تصورِ شیخ میں سرمست رہنے اور رحمتوں کے حصول ، کے لئے کرتے رہتے تھے۔ ملاح گہرے پانیوں میں اکثر یہ آواز بلند کرتے سنائی دیتے، ''دم بہا وَالحق'' اور یہ صدا اس وقت تک پانیوں پر سفر کرتی رہتی جب تک ناؤ کناروں کا بوسہ نہ لے لیتی۔ مقلدین اور مرید جب بھی عشائے ربانی میں نیاز پیش کرتے ہیں تو ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ بزرگ کی قفسِ عنصری سے آزاد روح اس وقت دریاؤں اور سمندروں پر گردش کر رہی ہے اور اس کی خوشنودی کے بغیر محفوظ سفر ممکن نہیں ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے ایک لفظ سے ایک ڈوبا ہوا سفینہ، تمام نفوس کے ساتھ، ایک بار پھر نمودار ہو گیا تھا اسی لئے چناب اور سندھ کے ملاح انہیں دوران سفر یاد کرتے ہیں اور ان سے مدد مانگتے ہیں۔

شیخ بہاؤالدین زکریا (زینتِ دیں)، جو بہاؤالحق کے نام سے مشہور ہیں، لیہ میں، 28 رمضان 566 ہجری میں، پیدا ہوئے جہاں ان کی جائے پیدائش کوٹ کروڑ ہے۔ ان کا شجرہِ نسب اسد بن ہاشم سے جا ملتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے دادا تھے اور ان کا خاندان قریش خاندان کہلاتا ہے۔ ان کے سلسلہ کے نویں بزرگ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور کروڑ میں قیام پزیر ہو گئے تھے۔ دوسری روایات کے مطابق کمال الدین، بہاؤالدین زکریا کے دادا، جن کا شجرہِ نسب پانچویں پشت میں سلطان حسین سے ملتا تھا عرب سے خورسان آئے اور وہاں سے ملتان آ گئے۔ ملتان میں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد وہ کروڑ چلے گئے اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے وجیہہ الدین کی شادی مولانا ہاشم الدین کی بیٹی سے کی اور اس جوڑے کی پاکیزگی اور محبت کا انعام بہاؤالدین زکریاؒ کی صورت میں خدا نے عطا کیا۔

بہاؤالدین کی عمر صرف بارہ سال تھی جب ان کے والدِ بزرگ وار انتقال کر گئے۔ اپنی ابتدائی عمر میں بہاؤالدین زکریاؒ نے خورسان کا سفر کیا اور پھر وہاں سے بخارہ چلے گئے۔ بخارہ میں تمام اکتسابی و روحانی علوم میں درجہِ کمال حاصل کرنے کے بعد وہ ایک بہت بڑے عالم کے طور پر سامنے آئے۔ پندرہ برسوں تک انہوں نے لوگوں کو روحانی اور دیگر علوم کا درس دیا اور چند سالوں کے اندر ایک کامل بزرگ اور صاحبِ علم آدمی کے طور پر ان کی شہرت کرہ ارض کے طول و عرض میں پھیلتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ حج کرنے کے لئے مکہ شریف گئے اور بعد میں پانچ سالوں تک حضرت محمد ﷺ کے روضہِ مبارک کے خادم رہے۔ مدینہ سے وہ یروشلم تشریف لے گئے اور تمام مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بعد ایشیا میں تمام مسلم ممالک سے ہوتے ہوئے بغداد پہنچ گئے جہاں وہ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید ہو گئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے سترہ دن کے بعد انہیں درویشوں کا اعزازی لباس عطا کر دیا جس سے باقی درویشوں کے دل میں حسد کی آگ جل اٹھی۔ اس پر شیخ الشیوخ نے اپنے مقلدین کو خطاب کرتے ہوئے کہا، ''تم کسی درخت کی سبز شاخوں کی طرح ہو جبکہ زکریا مکمل طور پر خشک ہو چکا ہے جو آسانی سے آگ پکڑ سکتا ہے اور بھسم ہو سکتا ہے۔ یہ تمہارا نقص نہیں ہے کہ زکریا عشقِ خداوندی کی آگ میں

بھسم ہونے کے لئے بالکل تیار ہے''۔مقلدین اس منطق پر مطمئن ہوگئے اوران کی حسد کی آگ پر اوس پڑ گئی۔

علم ودانش کے خزانے بانٹتے بانٹتے زکریاؒ 1222 عیسوی کو ملتان میں رونق افروز ہوئے۔ملتان میں پہلے پہل ان کی آمد کی مخالفت کی گئی تاہم بعد میں ان کے علم ودانش کے چرچے پورے ہندوستان میں ہوگئے اوراس شمع عشق خدا کے گرد پروانے ہی پروانے جمع ہوگئے۔کچھ عرصہ بعدانہیں دہلی معروف ترین بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے، ناصرالدین قباچہ کے دور میں، دہلی مدعو کیا۔حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے سوسال کی عمر پائی۔جب ان کے وصال کا وقت قریب آیا تو ایک سفید داڑھی اور سفید سر والے بزرگ ظاہر ہوئے اور، جیسا کہ دربار سے منسلک تاریخ کہتی ہے، انہوں نے ایک ملفوف خط ان کے بیٹے صدرالدین (الیاس صدر جمال) کی خدمت میں پیش کیا ۔اس بزرگ نے صدرالدین کو بتایا کہ خط اس کے قریب المرگ باپ کے لئے ہے۔بیٹے نے خط اپنے عظیم باپ کو دیا اور خود خاموشی سے واپس چلا آیا۔ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اس نے ایک غائبی آواز سنی،''دوست بہ دوست رسید''(دوست دوست کے ساتھ مل گیا) اوراس کے بعد فوراً اس عظیم بزرگ کے وصال کا اعلان کر دیا گیا۔بہاؤالدین زکریاؒ کا وصال 666 ہجری (1267 عیسوی) میں ہوا۔حضرت غیاث الدین غوری کے ہم عصر تھے اوران کی ارضی وعنصری زندگی خاندان غلاماں اور غوری بادشاہوں کے دور میں گذری۔وہ اس وقت بھی بقید حیاتِ عارضی تھے جب غیاث الدین بلبان، ملتان کا وائسرائے، مغلوں سے ٹکرایا۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کا مزار، اندرونی پیائش کے مطابق، 51 فٹ 9 انچ کے دائرے میں ہے۔اس کے اندر ایک مثمّنی عمارت ہے جس پر ایک نیم کروی گنبد بنا ہوا ہے۔حضرت کے مقبرے کو 1848 کے محاصرے کے دوران مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا تھا لیکن زائرین نے ایک بار پھر تعمیر کر لیا۔دربار کا مشرقی حصے پر آج بھی سجاوٹی گلکاری موجود ہے اوراس حصے پر وہی صیقل شدہ آرائشی اینٹیں لگی ہوئی ہیں جو اس تباہی سے پہلے موجود تھیں۔ان کے فرزند، صدرالدین، بھی اسی مزار میں دفن ہیں۔ان کی شادی بی بی راستی سے ہوئی تھی اوران کی پاکیزگی اور تقویٰ کا پھل انہیں رکن الدین الفتحؒ کی صورت میں ملا تھا۔رکن الدین الفتحؒ کو شاہ رکنِ عالمؒ (وہ ستون جس پر دنیا قائم ہے) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کی پیدائش 1281 عیسوی میں ہوئی تھی۔

شاہ رکن الدین عالم کا مزار ملتان کے لئے مایہءفخر وافتخار ہے۔اپنے دادا کے مزار کی طرح ان کا مزار بھی قلعے پر مغرب کی طرف موجود ہے۔ یہ مزار بھی ایک مثمّنی عمارت ہے جس کا اکاون فٹ نو انچ ہے۔اس مثمّن کے اوپر ایک چھوٹی ہشت پہلو عمارت ہے جس کا اندرونی راستہ اوپر کی طرف جاتا ہے جہاں مئوذن کے لئے خصوصی جگہ بنائی گئی ہے۔اس عمارت کے اوپر ایک کروّی گنبد موجود ہے جس کا بیرونی قطر 58 فٹ ہے۔اس عمارت کی اونچائی، بشمول تین فٹ چوکی، سوفٹ دو انچ ہے۔اس مزار کو ماہرین تعمیر نے اس قدر شاندار اور دلکش بنایا ہے کہ ہر طرف سے پندرہ میل دور سے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔عمارت مکمل طور پر سرخ اینٹوں سے بنائی گئی ہے جو نقش ونگار سے مزین کنگوڑی دیواروں پر استوار ہے۔مزار کی عمارت پر نقش ونگار کے لئے آسمانی نیلے اور سفید رنگ کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے اور اینٹوں پر ایسا خوشنما روغن کیا گیا ہے جو آنکھوں کو سکون دیتا ہے۔

جنرل کنہنگم کہتا ہے،''پچی کاری کی یہ فنکارانہ تراکیب (موزیک) جدید دور کے نہیں ہیں جس میں آرائشی کام بالکل سادہ ہوا کرتا تھا۔اس

عمارت کے نقش ونگار ابھرے ہوئے ہیں جن کا ابھار، بعض اوقات، پس منظر سے ڈیڑھ انچ باہر نکل آتا ہے۔ اس قسم کی تعمیر بہت ہی محنت طلب ہوا کرتی ہے لیکن اس کی تاثیر ناقابل یقین حد تک مسکن اور روح پرور ہے۔ اس میں مختلف رنگوں کا حسن ان کی ترتیب کے بدلنے سے سامنے آتا ہے اور ابھرے ہوئے نقش ونگار اس کے حسن میں مزید نکھار پیدا کرتے ہیں''۔

کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے کی تعمیر غیاث الدین تغلق نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر کرائی تھی لیکن اس کی اچانک موت کے بعد اس کے بیٹے، محمد تغلق، نے اسے رکن دین عالمؒ کی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کرلیا۔ یہ حقیقت ہندوستانی تاریخ کے ایک پراسرار واقع سے پردہ اٹھاتی ہے۔ ایک دن غیاث الدین تغلق تلنگانہ کو فتح کرنے کے بعد دہلی واپس آرہا تھا کہ راستے میں محمد تغلق اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود پایا گیا۔ شہزادے نے اس موقع پر اپنے باپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے بوڑھے باپ کو ایک پرتکلف ضیافت دینے کے لئے ایک چوبی خرگاہ میں مدعو کیا جو، دہلی سے دور، اسی مقصد کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ دعوت کے ختم ہونے کے بعد شہزادہ اور امراء بادشاہ کو لے کر باہر آرہے تھے کہ خرگاہ کی چھت بادشاہ کے اوپر آگری اور بادشاہ ملبے کے نیچے آکر مر گیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ ایک حادثہ ہو لیکن شہر سے دور اس خرگاہ کی تعمیر ذہن میں شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ حقیقت بھی اس واقعے کے پیچھے موجود سازش کو بے نقاب کرتی ہے کہ اس حادثے میں محمد تغلق کا بھائی، جو کہ بادشاہ کا جانشین چنا جاچکا تھا، بھاری لکڑیوں کے نیچے آکر مر گیا اور محمد تغلق کے لئے میدان خالی ہوگیا۔ فریشتہ دہلوی، جو ایک باریک بین مورخ ہے، سازش کے امکان کو رد نہیں کرتا اور اگر رکن دین عالمؒ جیسے بزرگ کی بات پر یقین کرلیا جائے، جس کی شہادت ابن بطوطہ دیتا ہے، تو اپنے باپ اور بھائی کا خون محمد تغلق کے دامن پر ہی نظر آتا ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ محمد تغلق نے ملک ضیادہ، جو سرکاری ماہر تعمیرات تھا، کے تعاون سے یہ موت کا جال بچھایا تھا جسے اس نے اس ''عظیم کارنامے'' کے انعام میں ہندوستان کا وزیر بنادیا تھا اور خواجہ جہاں کا لقب عطا کیا تھا۔ رکن الدین عالمؒ اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے اور ابن بطوطہ نے اس واقعے کی تفصیل خود انہی کے منہ سے سنی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے، ''شیخ رکن الدین نے مجھے بتایا کہ جس وقت خرگاہ کی چھت گری میں جائے وقوعہ پر سلطان کے قریب موجود تھا۔ اسی دوران محمد تغلق وہاں پہنچا اور اس نے مجھ سے کہا، ''مرشد! نماز کا وقت ہوچکا ہے آپ نماز کیلئے تشریف لے جائیں''۔ میں باہر چلا گیا اور وہ لوگ منصوبے کے مطابق ہاتھی کو چوبی خرگاہ کی پشت پر لے گئے۔ وہ دیوہیکل جانور ابھی اس عارضی عمارت کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اس کی چھت ایک دھماکے سے نیچے گر گئی اور سلطان اپنے محبوب فرزند کے ساتھ کچلا گیا۔ میں نے شور کی آواز سنی اور نماز پڑھے بغیر جائے وقوعہ کی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ عمارت گر چکی تھی اور محمد اپنے مددگاروں کو کلہاڑے لانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن اس کے حکم میں سنجیدگی اور پسرانہ محبت کی گرم جوشی موجود نہیں تھی۔ محمد کے حکم کے باوجود شام تک کلہاڑے نہ لائے گئے۔ بعد ازاں جب ملبہ ہٹایا گیا تو سلطان غیاث الدین اور اس کے بیٹے کی لاش برآمد ہوئی۔ لاشوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ آخری لمحات میں سلطان اپنے بیٹے کو بچانے کیلئے اس کی طرف جھکا تھا''۔ (ابن بطوطہ: ایلیٹ III)

ابن بطوطہ ہمیں مزید بتاتا ہے کہ اس خرگاہ کو ہنگامی حالات میں تین دن کے مختصر وقت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ عمارت زمین سے بہت اونچی تھی اور سارا کا سارا بوجھ چند ستونوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ ملک ضیادہ، جس کا اصل نام احمد بن ایاز تھا، کو اس کام کے لئے ''خصوصی'' ہدایات دی

گئیں تھیں اوراس نے اس کام میں ''جدید سائنسی اصولوں'' پر عمل کیا تھا۔ یہ سائنسی اصول یہ تھا کہ ایک مخصوص حصے کو چھوتے ہی پوری کی پوری عمارت زمین پر آ گرے۔ اس قسم کے منصوبے مشرقی بادشاہتوں میں اکثر بنا کرتے تھے۔ 1840 میں مہاراجہ کھاڑک سنگھ کے بیٹے نو نہال سنگھ نے تقریباً اسی انداز میں اپنے باپ کو، سلطنت کے لالچ میں، ٹھکانے لگا دیا۔ کھاڑک سنگھ کی موت کے بعد اس کی آخری رسومات شاہی انداز سے ادا کی گئیں اور کسی کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ مہاراجہ کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے۔

سیاح مزید لکھتا ہے کہ شہزادے نے عمارت کے اندر موجود لوگوں کو کھانا کھانے کے بعد باہر جانے دیا۔ لوگوں کے باہر جانے کے بعد اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ اسے ایک ہاتھی دکھانا چاہتا ہے جس پر سلطان نے اسے ہاتھی عمارت کے اندر لانے کی اجازت دے دی۔

ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اپنے باپ کو قتل کروانے والا شہزادہ اس بزرگ کو بچانے کے لئے مضطرب تھا اور بعد میں اس نے یہ شاندار مقبرہ تحفے میں دیکر اس کی خاموشی کی قیمت چکا دی۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو رکن الدین عالمؒ اپنے محترم دادا کے مقابلے میں کم پرہیزگار اور متقی نظر آتے ہیں جو ایک قد آور علمی اور روحانی شخصیت تھے۔ رکن الدین عالمؒ اپنے شاگردوں کو حیات بعد از ممات، کرم اور تناسخ (آواگون) کا قانون پڑھایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمام کائنات پر ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون نافذ ہے جو عمل کرنے کے تمام ہمہ گیر طبعی قوانین سے مشابہ ہے اور تمام واقعات کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ جو اس قانون کی آگہی حاصل نہیں کرتا غافل اور گنہگار رہو جاتا ہے اور ہمیشہ مادے کی دلدل میں پھنسا رہتا ہے۔ جبکہ آگاہ اور ہمیشہ پاک رہنے والا روح اعظم (اللہ تعالیٰ) کا وصال پا لیتا ہے جو کہ انسانی کاوشوں کا منتہیٰ ہے۔ اس کے علاوہ وہ مابعد الطبعیاتی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ یومِ قیامت کے حوالے سے وہ کہا کرتے تھے کہ قیامت کے دن شر پسند لوگ، اپنے گناہوں کی نوعیت کے مطابق، درندوں کی صوت میں اپنی قبروں سے باہر آئیں گے۔ اس طرح ظالم لوگ جنگلی چیتے بن کر قبروں سے برآمد ہونگے، عیاش اور جسم پرست لوگ بکرے بن جائیں گے اور بسیار خور سُور بن کر نکلیں گے۔

شاہ رکن الدین عالمؒ دہلی کے عظیم بزرگ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قریبی دوستوں میں سے ایک تھے اور دہلی کے کئی سلطان ان کی قدم بوسی کے لئے حاضری دیتے رہتے تھے۔ شاہ رکن الدین عالمؒ کا وصال 16 رجب المرجب 735 ہجری میں ہوا جب ان کی عمر 88 برس تھی۔ ان کے دربار کے موروثی سجادہ نشین ملتان کے مخدوم ہیں جن کے پنجاب اور سندھ میں لاکھوں ماننے والے موجود ہیں۔

شاہ شمس تبریزؒ

شاہ شمس تبریزؒ کا مزار ملتان کے قلعے کے مشرق میں دریائے راوی کے پرانے کنارے پر موجود ہے۔ یہ ایک تیس فٹ اونچی چوکور عمارت ہے جس کے اوپر نیم کروی گنبد موجود ہے۔ اس عمارت پر بھی صیقل شدہ نیلی اینٹوں سے کام لیا۔ اس بزرگ کا نام شمس الدین بن شاہ صلح بن مومن ہے اور ان کا تعلق امام جعفر صادق کے خاندان سے ہے۔ شاہ شمس تبریزؒ کی ولادت 17 رجب 560 ہجری (1166 عیسوی) کو اور وصال 21 رمضان المبارک 675 ہجری (1276 عیسوی) کو ہوا۔ شاہ شمس تبریزؒ کا اصل مزار ان کے پوتے، صدر الدین، نے

730 ہجری (1329 عیسوی) میں بنوایا تھا مگر مخدوم صفدر علی (الیاس مخدوم جیون شاہ) کے دور میں، جو ان کے مریدین میں سے تھے مہر علی کے نام سے، یہ مزار 1194 ہجری (1779 عیسوی) میں دوبارہ تعمیر کروایا اور اس پر پچھتر ہزار روپے لاگت آئی۔

(Tawarikh Zilla Multan p. 85)

کہا جاتا ہے کہ جب ہندوستان بھر میں بہاؤالدین زکریاؒ کا عروج تھا، شاہ شمس تبریزؒ اپنے ایک شاگرد کے ساتھ ایران سے ملتان تشریف لائے۔ راستے میں پڑنے والے تمام دریا انہوں نے اپنے مصلّے پر پار کئے اور اس طرح وہ اپنی شہرت اپنے ساتھ لے کر آئے۔ جب بہاؤالدین زکریاؒ کو ان کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے اسے شہر کے اندر نہ آنے دیا اور ایک دودھ سے بھرا ہوا پیالہ، جس میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں تھی، شاہ شمس تبریزؒ کو بھجوا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ملتان اولیاؤں سے اسی طرح لبریز ہے جس طرح یہ پیالہ دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ شاہ شمس تبریزؒ دودھ کا پیالہ زکریاؒ کو، ایک پھول ڈال کر، واپس بھجوا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر دوسرے بزرگ دودھ کی طرح ہیں تو میں گلاب کی طرح ہوں جو دودھ کی جگہ بھی نہیں لیتا اور اس سے منفرد بھی ہے۔

بہاؤالدین زکریاؒ اس ''گستاخی'' پر طیش میں آ گئے اور شاہ شمس تبریزؒ کو دست انداز کہنے لگے۔ انہوں نے سارے شہر میں اعلان کروا دیا کہ کوئی بھی شاہ شمس تبریزؒ کی کوئی مدد نہیں کریگا اور حتیٰ کہ اس کا دانہ پانی بھی بند رہے گا۔ شاہ شمس تبریزؒ خود تو خوراک کی غلامی سے آزاد تھے لیکن ان کے شاگرد کا فاقوں سے برا حال ہو گیا۔ جب شاہ شمس تبریزؒ نے یہ حالات دیکھے تو انہوں نے جنگل سے ہرن (بعض کتب میں فاختہ) کو بلایا اور اسے مسلمانوں کے مخصوص (Orthodox) انداز میں ذبح کر دیا۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو شہر میں بھیجا تا کہ وہ اس گوشت کو پکانے کے لئے لکڑیاں لے کر آئے لیکن لوگ بہاؤالدین زکریاؒ کے حکم کے پابند تھے اور کوئی آگ تک دینے کو تیار نہیں تھا۔ جب یہ لڑکا ایک حلوائی کی دکان پر گیا تو اس نے دودھ کا ایک برتن اس کے منہ پر دے مارا۔ لڑکا آنکھوں میں آنسو لئے اپنے آقا کے پاس پہنچا۔ شاہ شمس تبریزؒ نے جب یہ دیکھا تو وہ طیش میں آ گئے اور سورج سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، ''اے شمس! تو بھی شمس ہے اور میں بھی شمس ہوں۔ میرے قریب آؤ تا کہ میں تمہاری تمازت سے کھانا پکا سکوں جو یہاں کے مکار لوگ مجھے نہیں پکانے دیتے''۔ سورج فوراً قریب آ گیا اور شاہ شمس تبریزؒ نے اپنے شاگرد کے لئے گوشت بھون لیا۔ ملتان میں یہ روایت مشہور ہے کہ سورج، دوسری دنیا کی نسبت، ملتان سے سوا نیزہ زیادہ قریب ہے اور یہی ملتان کی شدید گرمی کی وجہ ہے۔

یہ وہ اسطورہ ہے جو ملتان کی جھلسا دینے والی گرمی کی وجہ پر ''روشنی'' ڈالتا ہے۔ اس واقعے کو کئی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ تاہم تمام واقعات ملتان کی شدید گرمی کی وجہ شاہ شمس تبریزؒ کو ہی بتاتے ہیں جس نے ہرن کا گوشت پکانے کے لئے سورج کو نیچے بلا لیا تھا۔ برنیز بھی اسی قسم کی ایک کہانی سنتا ہے اور اسے اپنی کتاب (Travels into Bokhara Vol. III P. 116) میں اس طرح بیان کرتا ہے، ''شاہ شمس تبریزؒ بغداد کے ایک بزرگ ہیں جن سے کئی مافوق الفطرت کرامات منسوب ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عام ہے کہ وہ بھی، دم عیسیٰ کی طرح، مردوں کو دوبارہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔ ایک کہانی کے مطابق ایک دن شاہ شمس تبریزؒ کے ارادوں کے پیش نظر اس کی کھال اتار دی گئی۔ وہ شہر میں خوراک مانگ رہے تھے کہ کسی نے انہیں ایک مچھلی دی جسے انہوں نے سورج کی طرف کیا تو سورج نے جھک کر مچھلی کو بھون

دیا۔ یہ واقعہ ان کی قابلِ گرفت شہرت کا باعث بنا اور ملتان کی ضرب المثالی گرمی کا الزام انہی پر ڈال دیا گیا۔
شاہ شمس تبریزؒ کے مزار پر دو تحریروں کی تختیاں موجود ہیں جن پر، بالترتیب، بارہ اور چودہ مصرعوں میں اس بزرگ کی کرامات اور روحانی طاقتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک پرسکون خلوت خانے (کُنج) میں موجود ہے جس پر نیلے رنگ کی اینٹوں کا کام کیا گیا ہے اور درمیان میں لگی تختی پر ''یا اللہ'' لکھا ہے اور اس کے مرکز میں ایک ہاتھ بنا ہوا ہے جسے پنجہ کہا جاتا ہے۔

نواب مظفر خان

بہاؤالحق کے دربار کے ساتھ نواب مظفر خان کا مزار ہے جو 1818 میں شیوخ کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے تھے۔ یہ جنگ اس وقت ہوئی تھی جب دیوان میسر چند، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے گورنر، شہر پر قبضہ کر لیا تھا اور قلعے پر بمباری شروع کر دی تھی۔ یہ جنگ فروری کے مہینے میں شروع ہوئی تھی اور جون کی دو تاریخ تک جاری رہی تھی اور اس کے نتیجے میں شہر کی دیواروں میں، احمد شاہ درانی کی زمزمہ بندوقوں سے، دو بڑے شگاف پڑ گئے تھے۔ یہ بندوقیں لاہور سے اسی مقصد کے لئے منگوائی گئی تھیں۔
اس جنگ میں معمر نواب کی بہادری، جب کہ مٹھی بھر لوگوں نے اس کا ساتھ دیا، نسبتاً جدید تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ کتاب اس واقعے کو تفصیل سے بیان نہیں کرے گی۔ تاہم ذیل میں دیا گیا اقتباس، جس میں نواب کی موت کے لمحات کو ضابطہ تحریر میں لایا گیا، کو میں یہاں بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔
لیپل گرفن اپنی مشہور کتاب Punjab Chiefs کے صفحہ نمبر 486 میں لکھتے ہیں، ''اس قلعے کی حفاظت کرنے والوں کی تعداد دو یا تین سو سے زیادہ نہیں تھی اور ان میں سے اکثر مظفر خان کے اپنے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ماندہ لوگوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا یا وہ دشمن کے ساتھ مل چکے تھے کیونکہ انہیں غداری کے انعام کے طور پر بھاری رشوت کی پیش کش کی گئی تھی۔ تاہم ہزاروں لوگ اپنے حرص کو لگام نہ دے سکے اور انہوں نے اپنے فرائض اخلاق عظمت سے منہ موڑ لیا تھا۔ آخر کار دو جون کو سادھو سنگھ نے وہی کچھ کیا جو پالُو سنگھ نے 1816 میں کیا تھا۔ وہ چند جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں جا گھسا اور چند لمحوں میں قلعے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب سکھ فوجوں نے اپنا پلڑا بھاری دیکھا تو وہ خضری دروازے کے زریعے شہر کے اندر پھلانگنے لگے۔ شہر کے اندر بوڑھا نواب اپنی آٹھ بیٹوں کو ساتھ لے کر، تلوار ہاتھ میں لئے غیرت پر مر مٹنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔
بوڑھے افغان نواب کی تلوار نے کئی سکھوں کی جان لے لی تو انہوں نے دیواروں سے فائرنگ شروع کر دی۔ نواب مظفر نے للکارا، ''مردوں کی طرح لڑو! انصاف سے لڑو!'' تاہم یہ ایسی دعوت تھی جسے سکھ قبول نہیں کر سکتے تھے۔ چند لمحوں میں سکھوں نے نواب صاحب اور ان کے پانچ بیٹوں، شاہنواز خان، ممتاز خان، عزیز خان، حق نواز خان اور شہباز خان کو مار ڈالا۔ اس طرح ملتان کا آخری مسلمان گورنر اپنے شہر کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے جان کا نذرانہ پیش کر گیا۔ وہ آج تک آخری سیدوزی قبیلے کے بہادر افغان کے طور پر یاد کئے جاتے ہیں جنہوں نے جنوبی پنجاب میں آخری بار حکومت کی۔

نواب صاحب کا مزار سبز اینٹوں سے بنایا گیا ہے جس کے صدر دروازے کی تختی پر کلمہء طیبہ اور فارسی تحریر درج ہے جس کا ترجمہ ذیل میں پیش ہے:

''حاجی اکبر زئی مظفر جیسے بہادر انسان کا بہادر بیٹا۔ وہ شخص جس نے جنگ کے دنوں میں اپنی تلوار سے فتح کی تاریخ لکھی۔ جب وہ سننے کے قابل نہ رہے انہوں کہا، ''یہی فتح کا دن ہے'' (1233 ہجری، 1818 عیسوی)''۔

مشرقی دیوار پر یہ تحریر موجود ہے:

''اقوامِ عالم اس مزار کے باغ پر غور و فکر کرتی ہیں۔ یہی وہ مزار ہے جو دنیا کو خوش بختی کی نوید دیتا ہے۔ یہ باغ عالمِ تخیل کو مصفا و منّزا کرتا ہے ۔ یہ باغ ماورائی دنیا کا ایک پھول ہے۔ جب بھی میں اس کی تاریخ پوچھتا ہوں مجھے بتایا جاتا ہے کہ اس کا بنانے والا یہاں کے گلاب کے پھولوں کی طرح خوش بخت تھا۔ پیر محمد، جس کی محنت کا ثمر آپ کے سامنے ہے''۔

بہاؤالحقؒ کے دربار کی دائیں جانب پتھر کا ایک چہار پہلو گاؤدم ستون موجود ہے جس کے اردگرد جنرل کنہنگم نے گارکی بنی ہوئی چٹانوں اور مٹی کے پرتوں سے، جس کی تہہ اپنی تشکیل کے کسی معین دور کا پتہ دیتی ہے بھولی بسری، تاریخ کشید کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ چہار پہلو ستون پچاس فٹ بلند ہے اور پانچ فٹ اساس پر قائم ہے۔ ستون پر سفید سنگ مرمر پر (انگریزی زبان میں) یہ عبارت درج ہے:

''پتھر کی اس سر دیادگار کے نیچے پیٹرک الیگزینڈر وانس اگنیو اور ولیم اینڈرسن دفن ہیں۔ جو حکومت برطانیہ سے اپنی درخواست پر ملتان کے والی دیوان مل راج سے اس کا اقتدار اور قلعہ حاصل کرنے آئے تھے لیکن 19 اپریل 1848 کو ملتان کی چھاؤنی نے ان پر حملہ کر دیا جس وقت ان کے سکھ محافظ انہیں تنہا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس سے اگلے دن قومی دیانتداری اور مہمان نوازی کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے، ملتان عیدگاہ کے احاطے میں، انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اور اس طرح دو کم سن عوامی خدمتگار پچیس اور اٹھائیس سال کی زندگی گزارنے کے بعد، تمام امیدوں، تمام خوابوں اور تمام صلاحیتوں سمیت چل دنیا سے رخصت کر دیے گئے۔ مگر مر کر بھی انہوں نے اپنے ملک اور قوم کے وقار میں اضافہ کیا۔ موت کی سرزمین پر قدم رکھنے سے قبل وہ اس قدر رخمی کر دیے گئے تھے کہ مزاحمت کرنا ناممکن تھا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حملہ آوروں کا انتظار کرتے رہے۔ جوانمردی اور قومی تفاخر سے انہوں نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ مرتے وقت انہوں نے اس دن کی پیشین گوئی کی جب ہزاروں انگریز اس سرزمین پر ان کی موت کا بدلہ لینے آئیں گے۔ وہ مل راج، اسکی فوج اور اس کے قلعے کو تباہ کر دیں گے۔ ان کی پیش بینی خواب نہیں تھا۔ ایک دن ان کے ملک کے سپاہیوں نے انہیں، اسی مقام پر، مفتوح قلعے کی چوٹی پر 25 جنوری 1849 کو، پورے اعزاز کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔ پنجاب کا حکومت برطانیہ کے سامنے جھکنا اور جنگ کا نقطہ عروج تھا جوان معصوم جوانوں کے بہیمانہ قتل سے شروع ہوئی''۔

ملتان کی قدیم ترین تجارت ریشم، سامان آرائش، کپاس، نیل (اصل نیل جو شرق الہند کے پودوں سے حاصل کیا جاتا تھا) پر مشتمل رہی ہے ۔ یہ اشیاء سندھ کے راستے سے بحیرہِ احمر لائی جاتی تھیں اور وہاں سے خلیج فارس اور فونیشا سے ہوتی ہوئی یورپ پہنچتی تھیں۔ عربوں نے کئی

صدیوں سے ان اشیاء کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور وہ سیلون، انڈین مجمع الجزائر (بحرالجزائر) اور ہندوستانی ساحلوں سے عطریات، مصالحہ جات، املتاس، اور دارچینی (ایشیائی گرم علاقوں میں پیدا ہونے والے لارل کے درخت کی اندرونی چھال) لے کر جاتے تھے اور دنیا بھر میں مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ ملتان آج تک پنجاب کے بڑے تجارتی مراکز میں سے ایک ہے جہاں سے تجارتی سامان با آسانی دوسرے علاقوں میں پہنچایا جا سکتا ہے۔

ملتان ریشم کے ریشوں اور کپاس کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے۔ خاص طور پر اس شہر کے کھیس اور لنگیاں (رنگین دھوتیاں)، جن کے حاشیوں پر طلائی کام کیا جاتا ہے، پورے ہندوستان میں بہت مشہور ہیں۔ ہندوستان کی بہترین ''شجاع خوانی'' ریشم یہیں پیدا کی جاتی ہے۔ خوبصورت اور رنگین مٹی کے برتن (نیلگوں برتن سازی کے نمونے)، مسلمانوں کی آمد کے دور سے ملتان کی خاص نشانی ہیں۔ اس فن کو ''کانسی یا چینی'' کہا جاتا جو چین سے ایران اور ایران سے مغلوں (تیمور لنگ کی چینی بیوی کے توسط سے) کے زریعے ہندوستان پہنچا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کی دیواروں پر چینی مٹی (پورسلین) سے آرائش وزیبائش کے رواج کو ہندوستان میں مغلوں نے متعارف کروایا تھا جو یہ سب کچھ ایران میں دیکھ کر آئے تھے۔ دوسری طرف اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ اینٹوں کا پکانے اور انہیں روغن کرنے کا فن، ہندوستانیوں نے سامی النسل لوگوں، کالدیوں اور عربوں، سے سیکھا تھا اور بعد میں یورپی اقوام بھی عربوں سے ہی یہ فن سیکھی تھیں۔ ملتان ہمیشہ سے روایتی برتن سازی (نیلگوں ڈیزائن والے برتن) میں مشہور رہا ہے اور یہاں کے نقش ونگار والے ظروف، گلدان پیالے اور لیمپ ہندوستان بھر میں مشہور رہے ہیں

جب مسلمانوں میں غلبہِ ذات اور توسیع پسندی کا جنون پیدا ہوا تو انہوں نے، دیگر علاقوں کی طرح، پنجاب اور سندھ کا رخ کیا اور مختصر عرصے میں مقامی آبادی کو زیر کر لیا۔ یہ لوگ توسیع پسند تو ضرور تھے لیکن وسعت قلبی سے محروم تھے۔ اپنے کٹر پن اور خود مرکزیت کی وجہ انہوں نے اپنی ہندو رعایا پر ظلم وستم کی انتہا کر دی اور ہندوؤں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے۔ دوسری طرف ہندو بھی مسلمانوں سے شدید نفرت کرنے لگے اور موقع بہ موقع بغاوتوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ یہ نفرت اس وقت شدت اختیار کر جاتی جب دونوں طرف سے خون کی ندیاں بہا دی جاتیں۔ جب مسلمانوں کو موقع ملتا تو وہ تحمل، وسعتِ نظری اور بردباری کے تمام ضابطوں کو بھول کر وحشی بن جاتے۔ دونوں اقوام کے مابین یہ مجنونانہ دشمنی صدیوں پر محیط ہے جس کے ثمرات خون ریزی اور جنگی جنون کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ پرہلاد کا مندر مسلمانوں نے کئی مرتبہ تباہ کیا اور اس کی جگہ، یا اس کے قریب، مسجد تعمیر کر دی گئی۔ تاہم ہندوؤں کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ مندر، پوری شان وشوکت سے، دوبارہ تعمیر کر دیا۔ ابن بطوطہ نے غیاث الدین تغلق کی بنائی ہوئی جامع مسجد پر خود یہ تحریر پڑھی تھی اور اس کا ہندو رعایا پر جو اثر پڑتا ہوگا آپ بھی سمجھ سکتے ہیں:

''میں نے تاتاریوں سے انتیس مرتبہ جنگ کی اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا اسی لئے مجھے 'ملک الغازی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یا پھر

ایسے بطلِ اعظم کے طور پر جس کا مقصد کافروں کے خلاف جنگ ہے''۔ (p.202)

اسی تحریر کی موجودگی کی شہادت بعد میں ضیا برنی نے بھی دی ہے۔(Zia Barni p. 416)

ملتان میں مختلف مسلمان حکومتوں اور سندھ میں عربوں کی ابتدائی فتوحات سے لے کر جنوبی پنجاب میں اسلامی حکومت کے خاتمے تک کا خلاصہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ تاہم یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی اگر ہم، جاتے جاتے، تاریخ کی دوبین سے ان بدلتے ہوئے مناظر پر ایک نظر اور ڈال لیں جن کے پیچھے وقت کی طاقت اور عروج وزوال کے ماورائی قانون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ان صوبائی گورنروں کا ذکر کریں گے جو، خاص طور پر مغل اور سید وزی دور میں، ملتان کی سیاست میں ڈرامائی کردار ادا کرتے رہے۔

جب بابر نے ہندوستان کے پایہ تخت پر قدم جمایا تو ملتان اس کے بیٹے مرزا عسکری کے حصے میں آیا جو کہ ہمایوں کا بھائی تھا۔ بعد ازاں مرزا عسکری کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ سیف الدین خان پوپل زئی کو دے دی گئی۔ ہمایوں، جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد، پنجاب اپنے بھائی کامران مرزا کے حوالے کر دیا۔ کامران مرزا نے اپنے ایک وفادار کو ملتان کے صوبے کا گورنر بنا کر بھیجا۔

اکبر کے دور میں، ملتان کی حکومت معین الدین خان کے ہاتھ میں آ گئی اور جہانگیر کے دور میں فتح خان کے ہاتھوں میں نظر آئی۔ شاہ جہان نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی ملتان اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو جھولی میں ڈال دیا لیکن بعد ازاں اسے دکن کا گورنر بنا کر ملتان نجابت خان کے سپرد کر دیا۔ ملتان کو اورنگزیب اور دارا شکوہ کو جاگیر کے طور پر بھی پیش کیا گیا۔

اورنگزیب کے دور میں کشمیر کے صوبیدار، لشکر خان، کو ملتان کا والی بنایا گیا۔ اس کے بعد ملتان کو جاگیر بنا کر شہزادہ معظم اور محمد اکبر کو بھی پیش کر دیا گیا۔ کئی گورنروں کے تبدیل ہونے کے بعد اس قنوطی حکمران نے شہزادہ معاذ الدین اور حیات خان کو یہاں کا گورنر بنا دیا۔ حیات خان کا انتقال 1728 عیسوی میں ہوا۔ محمد شاہ، جو کہ اس وقت کا حکمران تھا، نے عبدالصمد خان درانی کو ملتان کی حکومت سونپ دی۔ عبدالصمد درانی کا انتقال 1737 عیسوی میں ہوا۔ زاہد خان، جو کہ نواب مظفر خان کا جدامجد ہے، دریائے چناب کے کنارے رنگ پور کی جاگیر کا مالک تھا۔ نواب صاحب کے جدامجد سادھو خان 1558 میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی سلسلے کے ایک دوسرے خاندان میں، جو خضر خان سے شروع ہوتا ہے، احمد شاہ درانی پیدا ہوئے تھے۔ نواب صاحب ایک صاحب دانش آدمی تھے اور ان کے ایک دوست، قمر الدین خان نے جو دہلی کے دربار میں وزیر تھے انہیں شاہی خاندان سے روشناس کروایا تھا جب سلطنت زوال پزیر تھی اور نادار شاہ اس کی نادار سرحدوں کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

1738 میں ملتان کے متفقہ گورنر نے نئے نواب کو تسلیم نہ کیا اور جنگ پر تیار ہو گیا۔ تاہم اسے اس جنگ میں شکست ہوئی اور اس کے ساتھ زاہد خان کی فوج کو بھی ملتان سے باہر نکال دیا گیا۔ جب احمد شاہ درانی نے 1747 میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ملتان کی حکومت زاہد خان کے حصے میں آ گئی۔ پایہ تخت، دہلی، زاہد خان کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، اسی لئے شاہ نواز خان کو گورنر بنا کر بھیج دیا۔ شروع میں زاہد خان نے اپنے رقیب کا پرتپاک خیر مقدم کیا لیکن بعد میں مغل فوج کو اکٹھا کر کے اس کے خلاف جنگ کو تیار ہو گیا۔ جب شاہنواز خان زاہد خان

کی طوطا چشمی دیکھی تو اس نے ایک اور دشمن، لاہور کا گورنر میر منو، کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی شاہنواز کی ملتان آمد کو پسند نہیں کرتا۔ میر منو نے شاہنواز کی مدد کرنے کی بجائے اس کی موت کو آسان کرنے کا فطین منصوبہ بنایا اور کاؤرامال کی قیادت میں بہت بڑی فوج شاہنواز کے خلاف روانہ کردی۔ شاہنواز اور کاؤرامل کی فوج کے درمیان ملتان سے چالیس میل دور خوفناک جنگ ہوئی جس میں شاہنواز کو شکست ہوئی اور جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

میر منو، میر معین الملک، نے کاؤرامل کو ملتان کا گورنر بنادیا اور زاہد خان سیتا پور روانہ ہوگیا۔ کاؤرامال کو 1752 میں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں نے شکست دی۔ میر منو نے بعدازاں احمد شاہ ابدالی سے امن کے معاہدے پر دستخط کرالئے اور ایک افغان افسر علی محمد خان کو ملتان کا گورنر بنا دیا۔ علی محمد خان نے اپنی گورنرشپ کے دوران ملتان کے چوک میں جامع مسجد بھی تعمیر کروائی۔

1757 عیسوی میں مرہٹوں نے پنجاب پر چڑھائی کردی اور صالح بیگ کے ساتھ سنجلی بیگ کو ملتان پر قبضہ کرنے کیلئے بھیج دیا۔ جب علی محمد خان کو ان کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا اور ملتان پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔ تاہم یہ لوگ زیادہ عرصہ تک ملتان میں نہ رہ سکے اور احمد شاہ نے ایک بار پھر منظرِ عام پر آکر خواجہ یاقوت کو ملتان کا گورنر بنادیا۔ تاہم خواجہ ایک مخنّث گورنر ثابت ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے فوراً بعد علی محمد خان نے اسے ملتان سے بھاگنے پر مجبور کردیا اور ایک بار حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی۔

زاہد خان کا انتقال 1749 میں ہوا۔ احمد شاہ درانی نے جب گورنر کی تبدیلی کی خبر سنی تو اس نے زاہد خان کے بیٹے شجاع خان کو ملتان کا گورنر بننے کی پیش کش کی۔ شجاع خان نے اپنی فوج کو منظّم کیا اور ایک دن علی محمد خان کو ملتان سے باہر نکالنے کے لئے حملہ آور ہوا۔ علی محمد خان نے شجاع خان کی برتری کو تسلیم کرلیا اور ملتان کا ''مواب'' بننے کو تیار ہوگیا۔ شجاع خان نے 1817 میں ایک خوبصورت شہر، شجاع آباد اور اس کے قلعے، کی بنیاد رکھی جو کہ ملتان سے 23 میل جنوب میں واقع ہے۔ شہر کی تعمیر کے بعد، سارون مال کے دور میں، اس کے گرد پختہ دیوار بنائی گئی۔

اس دوران علی محمد خان ایک بار ملتان کا نواب بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس بار اس نے شجاع خان پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ نا صرف اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا بلکہ علی محمد کے زندان میں قیدی کے طور پر بھی رہنا پڑا۔ احمد شاہ درانی کو علی محمد پر اس قدر شدید غصہ آیا کہ وہ شاہی افواج کے ساتھ 1767 میں ملتان آن پہنچا۔ احمد شاہ درانی علی محمد اور اس کے بیٹوں کو کیفر کردار تک پہنچادیا۔ بعد میں ان کی لاشوں کو اونٹوں کی کمر پر لاد کر سارے شہر میں اعلان کیا گیا کہ تختِ ہند سے بغاوت کا انجام اس سے بھی بدتر ہوسکتا ہے۔ احمد شاہ نے ایک بار پھر شجاع کو ملتان کا گورنر بنادیا جو کہ ملتان کے آخری مسلمان حکمران، نواب مظفر خان، کا باپ تھا۔

ختم شد